جبر و اختیار
(یعنی مسئلہ تقدیر)
مصنف:-
حضرت امیر حمزہ شنواری
چشتی نظامی نیازی
مترجم:- سید طاہر بخاری
چشتی نظامی نیازی

# جبر واختیار

(یعنی مسئلہ تقدیر)

مصنف

حضرت امیر حمزہ شنواری

چشتی نظامی نیازی

مترجم:- طاہر بخاری

چشتی نظامی نیازی

نام کتاب :- جبر و اختیار

قیمت :- =/50 روپے

تعداد :- باراول ایک ہزار

پریس :- منظور عام پریس خیبر بازار پشاور

مطبوعاتی سلسلہ نمبر 6

ملنے کا پتہ :- حمزہ بابا ادبی جرگہ لنڈی کوتل خیبر ایجنسی

یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور

ناشر :- حمزہ اکیڈمی لنڈی کوتل۔ خیبر ایجنسی

# فہرست مضامین کتاب ہذا

# ضمانت

جوں جوں وقت گزرتا ہے حمزہ باباؒ کی شخصیت اور تعلیمات کے وہ خفیہ گوشے بھی منظر عام پر آنے لگتے ہیں جو کہ ابھی تک کسی وجہ سے عام لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے جسکی وجہ سے عام لوگوں میں عموماً اور تعلیمیافتا نوجوانوں کے دلوں میں خصوصاً یہ خواہش شدت سے پیدا ہورہی ہے کہ کاش وہ بھی حمزہ بابا کی زندگی میں ان کے شاگرد یا مرید ہوتے اور بابا سے براہِ راست فیضیاب ہوسکتے مگر یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ آج بھی حمزہ بابا کا مرید بننا نہ صرف ممکن بلکہ بہت آسان ہے اور وہ اِسطرح کہ آپ جناب سید طاہر بخاری صاحب سے مل لیجئے میں پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں اور میں ضامن اور گولہ ہوں اِس دنیا میں بھی اور اُس میں بھی کہ آپ نے حمزہ باباؒ سے ملاقات کی ہے۔

ڈاکٹر مسعود حمزوی

پولیس ہسپتال پشاور

# قطعہ

بشرف تعلق وعقیدت

محترم جناب سید طاہر بخاری صاحب

دام لطفکم

(بفرمائش خاص جناب محمد سلیم قادری چشتی

نظامی نیازی تعمل کنندہ

صاحبزادہ عبدالخالق خلیقؔ چشتی نظامی)

لاالہ کی ہی سہی ''ضرب'' کاری چاہیئے
''عشق'' کی اپنے لہو سے آبیاری چاہیئے
زخم بھرنے سے ہے لذت زخم رسنے میں سوا
''ہُو'' کے تیروں کی یہاں خدمت گزاری چاہیئے
ہو اگر ''فقر وسخاء'' کی منزلوں کا راہرو
''رُعب'' جسم ناتواں کا پھر بھی طاری چاہیئے

منزل ''صدق وصفاء'' میں کجروی پاؤ اگر
پھر ''معالج'' ہمسفر طاہر بخاری چاہیئے

''چشتیوں'' کی کشتیوں میں بیٹھ کر حضرت سلیم
''چار یار'' و ''پنجتن'' کی پاسداری چاہیئے

''ذکر'' کا دشمن لگے شب کو جو تسبیح کا وجود
رات کے پچھلے پہر اختر شماری چاہیئے

رمز حسن وعشق کو اب تک نہ سمجھا ''وہ'' خلیق
مل کے ''کج فہمی'' پہ اس کی اشکباری چاہیئے

# ''مقدمہ''

جبر و اختیار کا اردو ترجمہ آپ کے سامنے ہے۔ بنیادی طور پر یہ تقدیر کے مسئلے پر لکھی گئی ایک انتہائی دقیق اور محققانہ کتاب ہے مگر آپ دیکھیں گے اور محسوس فرمائیں گے کہ اس میں تصوف، دینیات، توحید، فلسفہ اور نفسیات کی چاشنی بھی موجود ہے اور اس لحاظ سے کتاب کی جامعیت اور افادیت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

جناب وقبلہ حضرت حمزہ بابا رحمتہ اللہ علیہ کو متعدد علوم وفنون پر عبور حاصل تھا وہ انسانی نفسیات کے بھی ایک بہت بڑے ماہر تھے۔ اور اس کی ایک مثال یہ کتاب ''جبر و اختیار'' ہے وہ اس طرح کہ انہوں نے تقدیر جیسے مشکل، خشک اور ذہن کو تھکا دینے والے عنوان پر اپنے خیالات اور افکار پیش کرنے کے لئے ''مکالمات'' کا طریقہ اختیار کیا اور کتاب کو ''ڈرامے'' کی شکل دے کر انتہائی دلچسپ بنا دیا ہے تاکہ ان کا قاری تقدیر، تصوف اور نفسیات وغیرہ کی اصطلاحات کا بھاری پن محسوس نہ کرے اور سہولت کے ساتھ کتاب پڑھے۔ میرے خیال میں ایسے دقیق نکات اور نامانوس اصطلاحات کو اپنے قارئین تک پہنچانے کے لئے بہترین طریقہ یہی تھا کہ ''جبر و اختیار'' کا رنگ مکالماتی ہو۔ مکالمات بھی ایسے دلچسپ کہ ایک مکالمہ پڑھ لینے کے بعد قاری کے تجسس میں اضافہ ہو اور پوری دلجمعی کے ساتھ اگلا مکالمہ پڑھنے کے لئے مستعد ہو۔ مزید برآں میرے ناقص خیال میں حضرت بابا نے اپنی عمر کے حاصل مجاہدہ حاصل مطالعہ اور حاصل مشاہدہ کو نہایت آسان لفظوں میں اپنے قاری کو آگے رکھ دیا ہے اور ''جبر و اختیار'' اس لحاظ سے بھی ایک قابل قدر کتاب ہے کہ یہ ایک پختون صوفی اور دانشور نے مسئلہ تقدیر پر پشتو زبان میں ایک نادر اور بلند پایہ کتاب تصنیف کی ہے کیونکہ اصل کتاب پشتو زبان میں تحریر کی گئی ہے اور یہ اسی کا اردو میں ترجمہ ہے۔

اس کتاب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ تقدیر کے مسئلے پر بحث میں شریک سارے احباب

ایک دوسرے کے عقیدے کا احترام کرتے ہیں۔آپ مطالعہ کے دوران محسوس فرمائیں گے کہ کوئی فرد بھی کسی دوسرے شریک گفتگو کی بات یا نظریات کا مذاق نہیں اڑاتا اور نہ ہی طنزیہ لہجہ اختیار کرتا ہے وہ پوری خاموشی سے اپنے مخالف کی بات سنتا ہے اور مکمل احترام اور معقولیت سے اس کا جواب دیتا ہے۔ان میں سے کوئی بھی کسی مخالف دوست کو ''کافر'' یا ''مردود'' نہیں کہتا ہر ایک اپنی علمیت اور تجربہ کی بنیاد بے خطر ہو کر اپنا اپنا نظریہ پیش کرتا ہے۔نظریاتی اور انفرادی طور پر ہر ایک دوست کسی الگ تھلگ جزیرے میں رہتا ہے مگر عقیدے اور نظریے کے اختلاف کے باوجود بحث میں تلخی پیدا نہیں ہوتی۔ بحث کے دوران سب دوستوں کی قوت برداشت قابل ستائش تو ہے ہی۔قابل تقلید بھی ہے۔مثال کے طور پر ڈاکٹر مکرم بنیادی طور پر پکا ملحد ہے وہ برملا طور پر خدا کے ذوالجلال کی ہستی کو نہیں مانتا۔وہ کسی مذہب پر بھی یقین نہیں رکھتا۔اور اس سلسلے میں دلائل بھی پیش کرتا ہے جبکہ مولوی احمد ایک ملا ہے۔مگر بحث کے دوران ڈاکٹر مولوی صاحب کے مقام و احترام کو مدنظر رکھ کر انتہائی معقولیت سے بات کرتا ہے۔اس طرح ملا ہو کر بھی مولوی احمد نہ تو تنگ نظر ہے اور نہ ہی جھگڑالو اور متعصب ہے۔وہ آپے سے باہر نہیں نکلتا۔ بلکہ ایک متجر اور روشن خیال عالم دین کے روپ میں دین و مذہب کے خلاف دلائل سنتا ہے۔مگر کسی نامعقول ملا کی طرح۔کافر ساز نہیں بلکہ وہ صحیح معنوں میں ایک عالم دین ہے وہ بہترین اور نہایت معقول دلائل سے مالا مال ہے چنانچہ کسی مخالف کی مخالفانہ بات سن کر منہ میں جھاگ نہیں لاتا بلکہ ایک عالمانہ دلیل پیش کر دیتا ہے کاش! ہمارے نیم ملا۔مولوی احمد کی طرح روشن خیال اور حلیم الطبع ہوتے۔

دیگر اصحاب مباحثہ میں داؤد خان ''جبر'' کا قائل ہے اور سب کچھ خدا کرتا ہے کا نعرہ لگاتے ہوئے وہ بھی قرآن حکیم سے دلائل پیش کرتا ہے اس کے برعکس اسلم ''قدر'' (اختیار) کا قائل ہے وہ سمجھتا ہے کہ سب کچھ انسان خود کرتا ہے گویا انسان مکمل طور پر مختار ہے۔اسلم بھی قرآن حکیم سے دلائل پیش کرتا ہے ان کے علاوہ اکرم معتدل مزاج رکھنے والا فلسفی ہے۔اسی طرح اشرف خان

حجرے کا مالک اور ایک سمجھدار نوجوان ہے وہ مباحثوں کے دوران بعینہ صدر مجلس کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔

سب سے آخر میں شریک گفتگو اکبر نامی ایک صوفی ہے۔(اور آپ فرض کر سکتے ہیں کہ یہ بذات خود حمزہ بابا ہیں۔ اگرچہ دوسرے کرداروں میں بھی آپ خود ہی نظر آتے ہیں) صوفی صاحب تصوف کے علاوہ وہ فلسفہ' نفسیات' دینیات اور تاریخ وغیرہ پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید سائنس سے بھی نابلد نہیں۔ یہی صوفی۔ ڈاکٹر مکرم کے آگے ایسے نادر نکات کا ایک ڈھیر لگا دیتے ہیں کہ ڈاکٹر کے پاس مان لینے کے سوا کوئی دوسرا چارہ کار نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ شک اور یقین کی وادیوں میں پھنس کر رہ جاتا ہے چنانچہ الحاد اور انکار کا یہ داعی اپنے ایک مکالمہ میں مولوی احمد سے کہتا ہے کہ:

''مولوی صاحب! سچی بات یہ ہے کہ وجود باری تعالیٰ کے سلسلے میں بے حد مشکلات سے دوچار ہو گیا ہوں۔(حالت یہ ہے) کہ اب نہ تو انکار کر سکتا ہوں اور نہ ہی اقرار''

دراصل حق تعالیٰ کو علت اولیٰ تسلیم کر لینے اور مشیت تکوینی اور مشعیت تشریعی کو بھی مان لینے کے بعد ڈاکٹر مکرم کے لئے کوئی دوسرا چارہ کار نہیں رہتا اور آخر کار مباحث وگفتگو کا نچوڑ حق تعالیٰ کے علم اور ارادہ میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حق تعالیٰ کے علم کے ساتھ اس کے ارادہ کا شامل ہونا ضروری نہیں اور قرآنی آیتوں کو بھی اسی معیار سے دیکھنا چاہئے۔ بہ الفاظ دیگر قرآنی آیتوں میں کوئی تضاد نہیں یہ اللہ کا کلام ہے جو انسانوں کو نور ہدایت دیتا رہے گا۔

الغرض جناب وقبلہ حضرت حمزہ بابا کی اس عالمانہ کتاب (جبر واختیار) میں تقریر کے بارے میں جو کچھ لکھا یا سمجھایا گیا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ظاہر ہیکہ یہ مکالمات کی شکل میں تحریر کی گئی ہے اور ان مکالمات کو پڑھ لینے کے بعد ایک فاضل قاری جبر وقدر کے بارے میں کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ سکتا

ہے مگر کسی نتیجہ پر پہنچنے کی صورت میں یہ احساس بھی ہوگا کہ اس سلسلے میں ہمارے پاس تین معتبر حوالے ہیں۔ قرآن، حدیث اور علمائے امت کے ظاہری اور باطنی افکار و معلومات! جہاں تک قرآن عظیم الشان کی مبارک آیتوں کا تعلق ہے اور جبر و اختیار کے مکالمات میں بھی ان کا ذکر ہوا ہے اور ایسی مبارک آیتوں کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ ہر انفرادی طبقہ فکر کے اصحاب ایسی آیتوں کو اپنے انفرادی عقیدے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں مثال کے طور پر:

(۱) مااصاب من مصيبة الا باذن الله

(۲) قل كل من عند الله

(۳) ما اصابكم من مصيبة فبما كسبت ايديكم

وغیرہ تو اس ضمن میں صرف اسی قدر عرض کیا جاسکتا ہے کہ ایسی آیتوں کو سمجھنے یا ان پر غور کرنے کے ضمن میں چند اہم امور کو خیال رکھنا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک تو سیاق و سباق ہے دوسرا موقع و محل ہے تیسرا وہ لوگ ہیں جن کے متعلق یا جن کو مخاطب فرمایا گیا ہے سیاق و سباق اور موقعہ و محل کی اہمیت تو ظاہر ہے جبکہ لوگوں کو بھی تین اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک قسم کے لوگ وہ صاحبان فہم ہیں جو اعلیٰ ذہن کے ساتھ ساتھ وافر مقدار میں علم و دانش رکھتے ہیں دوسری قسم کے لوگ اوسط درجے کی ذہنی صلاحیت اور درمیانے درجے کا علم رکھتے ہیں۔ تیسری قسم کے لوگ عام لوگ ہیں جو عموماً کم علم یا بے علم ہوتے ہیں اور تقلیدی طور پر سنی سنائی باتوں پر یقین رکھتے ہیں ہمارے خیال میں قرآن کی آیتیں اور احادیث نبوی ﷺ میں ان باتوں کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرآن عظیم الشان کی آیتوں میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں چونکہ یہ چیز ہمارے موضوع سے باہر ہے لہذا اس عنوان پر مزید لکھنے کی ضرورت نہیں۔ خود سمجھ لینا چاہئے۔

لیکن بالفرض اگر کسی آیت قرآنی کے متعلق کسی دانشور یا عالم فاضل انسان کو سمجھنے میں دقت درپیش ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے موقعوں پر حضور اقدس ﷺ کے ارشادات مقدسہ سے روشنی اور

رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے مثلاً جبر و اختیار کے مسئلہ کو لے لیجئے۔تو اس سلسلے میں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ خود شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس بارے میں کیا فرمایا ہے؟ اور اس حقیر راقم کے خیال میں ہمیں ایک صحیح اور محفوظ طریقہ ہے۔ چنانچہ ترمذی شریف کی ایک حدیث مبارکہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے!

**عن عبادة بن الصامت (رضی الله عنه) عن النبی صلی الله علیه و آله وسلم قال ان اول ما خلق الله القلم. فقال اکتب . فقال ما اکتب . قال اکتب القدر وما کان و ما هو کاین الی الابد**

''حضرت عبادہ بن صامتؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے حق تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اور اس سے فرمایا کہ لکھو۔ تو قلم نے عرض کیا کہ کیا لکھوں؟ تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تقدیر لکھو اور جو کچھ ہوا ہے یا ہوتا رہے گا۔''

اس کا مطلب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ''تقدیر'' سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جو حق تعالیٰ کے حکم سے تحریر کی گئی ہے چنانچہ اس سے انکار قطعی ناممکن ہے اور اسی طرح ایک دوسری حدیث کے حوالے سے واضح ہوتا ہے کہ اسی تقدیر کی لکھائی زمین و آسمان کی تخلیق سے بھی پچاس ہزار سال پہلے عمل میں آتی تھی۔ جس کی وضاحت حضرت ابن عمرؓ کی روایت کردہ حدیث سے ہوتی ہے ارشاد نبوی ﷺ ہے!

**عن ابن عمرؓ الله مقادیر قبل ان یخلق السموات والارض بخمسین الف سنة**

حضرت ابن عمرؓ حضور اقدس ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا چنانچہ اس حدیث مبارک سے یہی بات حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ یہ ایک حقیقت ہے بلکہ زمین اور آسمانوں کی تخلیق سے بھی پچاس ہزار سال قبل تحریر کی گئی ہے اس کے علاوہ علم الٰہی اور ارادہ خداوندی کا بھی واضح ثبوت مہیا ہوتا ہے اسی طرح اعیان ثابتہ اور اعیان خارجہ کا حوالہ بھی سمجھ میں آ سکتا ہے یعنی جس علمی

کارخانہ الٰہی کو خارج میں لانا مقصود تھا تو اسی نقطہ نظر سے تقادیر کا ہونا اور لکھنا بہت ضروری تھا۔ اس لئے کہ ایک عالم وقادر اور ارادے کے مالک ہستی نے حضور علیہ کو اسی جہان خارج میں ظاہر فرمانا تھا گویا ''بے سوچے سمجھے'' یا محض اتفاق کی بات ہرگز ہرگز نہ تھی جس طرح ہمارے ملاحدہ مادئین کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ اتفاقی طور پر وجود میں آیا ہے اور یہ مادے کا کمال ہے مگر مادہ بذات خود جاہل ہے۔ بہرنوع صحیح بات یہ ہے کہ جو کچھ ہونا تھا پہلے سے علم الٰہی میں موجود تھا اور پوری صحت اور صفائی کے ساتھ ایک باقاعدہ منصوبے کے ماتحت ظاہر کرنا تھا۔ چنانچہ ہادی برحق ﷺ نے اس پر ایمان لانے کی ہدایات فرمائی اور اس پر ترمذی شریف کی یہ حدیث نبوی ﷺ شاہد ہے!

لا یؤمن عبد حتی یومن بالقدر خیرہ و شرہ

''کوئی آدمی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ تقدیر کے خیر وشر پر ایمان نہ لائے دوسرے الفاظ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس امر پر زور دیا ہے ہر مومن کے لئے لازم ہیکہ تقدیر پر ایمان رکھے۔ اور اس کا ثبوت سند امام اعظمؒ کی اس حدیث مبارک سے بھی ملتا ہے:

عن ابن عمرؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یحی قوم یقولون لاقدر ثم یخرجون منہ الی الزندقۃ فاذا لقیتمو ھم فلا تسلمو علیھم واذا مرضو فلا تعو دوھم واذا ماتو فلا تشھدوا جنائز ھم فانھم شعۃ الرجال و مجوس ھذہ الامۃ حقا علی اللہ ایلحقھم بہ

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو کہے گی کہ تقدیر (نام کی) کوئی چیز نہیں (یعنی تقدیر کو نہ مانے گی) چنانچہ وہ زندیق ہوجائے گی جب تم ان سے ملو تو ان پر سلام مت ڈالو جب وہ بیمار ہوجائیں تو ان کی عیادت نہ کرنا اور جب وہ مرجائیں تو ان کی نماز جنازہ میں شریک نہ ہونا بلاشبہ یہ دجال کا گروہ اور اس امت کے مجوس ہوں گے اور حق ہے اللہ پر کہ اس کو ان سے ملا'' ان ارشادات نبویؐ سے اس مسئلے کی اہمیت کا ثبوت ملتا ہے۔

اسی مسند ہی کیا یک اور حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

القدرية مجوس ذ الامة

''قدری (مکمل مختاری یا اختیار) کا عقیدہ رکھنے والے اس امت کے مجوس ہیں'

چار لفظوں کے اس حدیث مبارک میں حقائق کا ایک سمندر سمویا گیا ہے ایک تو یہ کہ انسان ہرگز مکمل طور پر مختار نہیں اس لئے کہ اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے تو ہر وقت اس کے سر پر یہ خطرہ منڈلاتا رہے گا کہ زندگی کے کسی دور میں وہ حق تعالیٰ کی ہستی کا منکر ہو جائے گا کیونکہ اگر اسے یہ زعم ہو کہ سب کچھ میں خود کرتا ہوں اور مختار بھی ہوں تو خدا برحق ہستی کا تصور کمزور ہوتا چلا جائے گا اور یہ اسلامی روح کے خلاف ہوگا۔ دوسری بات یہ کہ ایسا انسان مادی دنیا میں گم ہو کر روح کی دنیا سے دور ہو جائیگا اور سچی بات یہ ہے کہ اس امر کا اندازہ ہمارے موجودہ دور کے مادی طوفان سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے اور ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں کہ اس دور کا ایک سائنس دان یا موجد یا عام آدمی اسی غلط فہمی کا شکار ہے کہ وہ خود ہی سب کچھ کر سکتا ہے اور اس لایعنی خیال کا نتیجہ یہ ہے کہ انہوں نے حق تعالیٰ کی برحق ہستی کو درمیان سے خارج کر دیا ہے میں اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتا صرف اتنی گزارش کروں گا کہ ایکس ریز کا تجربہ تمام موجدین اور سائنس دانوں کے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ ایسا کیونکر ہوا اور کیسے؟ مختصر یہ کہ مکمل اختیار کا عقیدہ رکھنے میں یہی نقص ہے کہ آخرکار یہ عقیدہ حق تعالیٰ کی برحق ہستی کیا نکار پر منتج ہوگا۔

اب اس مسئلے کا دوسرا رخ لے لیجئے اور وہ یہ کہ چلو مان لیا انسان مکمل طور پر مختار نہیں ہے تو بصورت دیگر کیا مجبور محض ہے؟ لیکن عقل سلیم یہ بھی تسلیم نہ کرے گی کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے کہ انسان مجبور محض ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہاتھ پاؤں لپیٹ کر ایک مفلوج اور بے حس شے کی شکل اختیار کرے گا اور ایسا انسان خدا کی ان عطا کردہ قوتوں کو کام میں لانے سے رہ جائے گا جو اس کو زندہ رہنے اور بشری ارتقاء کے لئے دی گئی ہیں اور یہ کفران نعمت ہوگا یہاں پر کہا جاسکتا ہے کہ ایسے شخص کی شخصیت

خالص روحانی یا ملکی صورت اختیار لے گی اور یہ درست نہ ہوگا کیونکہ اگر انسان صرف روحانیت کو اختیار کر لے تو یہ کوئی کمال نہ ہوگا مگر کیوں؟ تو اس لئے کہ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ انسان کا مرتبہ فرشتہ سے بہت بلند اور ارفع ہے اور فرشتہ صرف روح کی دنیا سے وابستہ ہے جبکہ انسان کا تعلق اس مادی جہاں سے بھی ہے اور روح سے بھی رشتہ قائم ہونا چاہئے اسی کو نفس اور روح یا دنیا و آخرت کا تعلق بھی کہہ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فرشتے کا نفس، دنیا یا عالم مادیت سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن انسان کا تعلق یا رشتہ بہ یک وقت نفس سے بھی قائم ہے اور روح سے بھی۔ یہ بھی معلوم ہے کہ نفس (مادے) کا رخ کسی ایک مخالف رخ تو ہے اور روح کا کسی دوسرے کو۔ مگر یہ کمال انسان کو حاصل ہے کہ ان دونوں کو قابو میں لا کر انسانیت کے اعلیٰ منصب کو حاصل کر لیتا ہے ان دونوں کی مثال بجلی کے منفی اور مثبت تاروں کی طرح سمجھ لینا چاہئے اور قدرت خداوندی ملاحظہ فرمائیے کہ جب یہ مخالف تاریں آپس میں ملتی ہیں تو کرنٹ یا قوت پیدا ہوتی ہے اور میں اس سلسلے میں اتنا ہی کافی سمجھتا ہوں۔

مسند امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی متذکرہ بالا حدیث مبارک سے ایک خیال یہ بھی ابھر کر سامنے آ جاتا ہے اور جیسے عرض کیا گیا ہے کہ بالفرض اگر انسان مکمل طور پر مختار نہیں تو مجبور ہوگا؟ ہوسکتا ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی یہ وسوسہ ہوا ہو؟ لہٰذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسی قسم کا سوال بھی ہوا ہے مثلاً ترمذی شریف کی ایک حدیث مبارک میں حضرت ابن خرامۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

**عن ابی خرامة قال سئلت رسول الله ﷺ دواء افتداوی به وتقاة نتقی بهاهل هی ترد من قدر الله شیئا۔؟ قال هی من قدر الله**

حضرت ابو خرامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ مجھے خبر دیں ہم جو شر سے بچنے کے لئے دعا یا دور کا اہتمام کرتے ہیں یا دشمن سے بچنے کے لئے اسلحہ یا ڈھال وغیرہ استعمال کرتے ہیں تو کیا یہ تقدیر الٰہی کے خلاف

ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ بھی تقدیر الٰہی میں سے ہیں۔

ظاہر ہے کہ انسان اسی مادی جہاں میں بھی رہتا ہے اور اس حدیث مبارک کی روشنی میں ایک مومن کو اس جہان مادی کی اشیاء سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے اور یہ بھی تقدیر الٰہی میں شامل ہوگا یعنی تقدیر الٰہی کی تحریر سے خارج نہ ہوگا چنانچہ یہ بھی تقدیر الٰہی ہوگی کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس جہان میں رہنے کے لئے سب انسانوں کو نفس (مادہ) اور روح دونوں سے نوازا گیا ہے ان کو آپ چاہیں تو جبر و اختیار بھی کہہ سکتے ہیں اور جب ایک آدمی ان دونوں کو خدا اور رسول ﷺ کے احکام کے مطابق کام میں لائے گا یا بہ الفاظ دیگر نفس اور روح کو زیر کرے گا تو آگے چل کر انسانیت کے مرتبہ پر فائز ہوگا اور صحیح معنوں میں خلافت و نیابت الٰہی کا حقدار ہوگا۔ اسلحہ سے کامیابی یا ناکامی اور دوائی سے شفا یا دوائی کا بے اثر ہونا بھی تقدیر الٰہی میں شامل ہے یعنی جیسا تقدیر میں لکھا ہوگا وہی صادر ہوگا اور حدیث کا مطلب بھی یہی ہے واللہ اعلم

حضور اقدس ﷺ نے امت مسلمہ کو تقدیر کے بارے میں پوری طرح سمجھایا ہے اسی ضمن میں امام ترمذی رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث مبارک جس کی روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کی ہے اور ترمذی شریف کی کتاب القدر میں موجود ہے فرماتے ہیں:

عن ابی هريرة قال خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم و نحن متنازع فی القدر . فغضب حتی احمر و جهه فقال ابهذا امرتم. ام لهذا ارسلت اليكم انما هلك من كان قبلكم حين تنازعوا فی هذا الامر عزمت عليكم الاتنازعوفيه

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے جبکہ ہم تقدیر کے متعلق جھگڑنے میں مصروف تھے تو آپؐ نے غصہ ہو کر ارشاد فرمایا کہ کیا تمہیں یہ حکم دیا گیا ہے یا مجھے اس لئے بھیجا گیا ہے؟ (یاد رکھو) تم سے پہلے اس معاملے میں (تقدیر کے سلسلے میں) جھگڑنے والے ہلاک کئے گئے۔ میں تم پر لازم کرتا ہوں کہ اس معاملے میں مت جھگڑو۔

اس حدیث مبارک کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ کسی موقع پر اصحابؓ رسول تقدیر کے بارے میں بحث فرماتے ہوں گے اور دو گروہوں میں تقسیم ہوئے ہوں گے ایک گروہ اپنے عقیدے کے مطابق دلائل دیتا ہوگا اور دوسرا اس کے مخالف عقیدہ کو سامنے لاتا ہوگا بحث کی گرمی نے جھگڑنے کی صورت اختیار کی ہوگی اور اسی اثناء میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہوں گے تو ان کو سمجھانا ضروری سمجھا گیا اور ارشاد فرمایا کہ گویا تقدیر کے سلسلے میں جھگڑنے' شور مچانے' یا طیش میں آ کر تنازعہ کا ماحول پیدا کرنا کوئی معنی نہیں رکھتے کیونکہ قبل ازیں بہت سے لوگ اس سلسلے میں لڑ کر ختم ہو گئے ہیں یہی قرین قیاس ہے باقی علم اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔

یہاں پر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ تقدیر کے بارے میں کوئی بات ہی نہ کی جائے کیونکہ ظاہراً حق تعالیٰ نے عظیم الشان میں اور حضور اقدسؐ نے اپنی احادیث مبارکہ میں اس کا ذکر فرمایا ہے اور ایک مفسر قرآن یا محدث یا ان کے کسی قاری کو اجازت ہونی چاہئے کہ قرآن و حدیث کے مطابق گفتگو کرے یا خصوصی طور پر ایسی گفتگو جس میں تنازعہ پیدا کرنے کا شائبہ نہ ہو۔

مختصر لفظوں میں اس حقیر و فقیر کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو قرآنی آیتوں میں تضاد ہے اور نہ ہی ایک مسلمان ایسا سوچ سکتا ہے بے شک قرآن عظیم الشان کی بعض آیتیں عام عقل رکھنے والے حضرات کی سمجھ سے بالا ہیں مگر خدا کا شکر ہے کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کی وضاحت فرما دی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تقدیر کے بارے میں اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کو بھی سمجھایا اسی سلسلے میں امیر المومنین علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے بھی پوچھا گیا تھا کہ:

''یا علیؓ! انسان مختار ہے یا مجبور؟''

تو مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ:

اے شخص! اپنی ایک ٹانگ اوپر اٹھا لو۔

پوچھنے والے نے ایک ٹانگ اٹھا لی تو امیر المومنین نے فرمایا کہ:

اب اپنی دوسری ٹانگ بھی اٹھا لیجئے

لہذا پوچھنے والے نے معذوری کا اظہار کرتے ہوئے عرض کی کہ:

یا علیؓ ایسا ممکن نہیں۔ گر جاؤں گا۔

دراصل پوچھنے والے کو اس عملی مثال سے سمجھا دیا کہ بعض غیر اختیاری معاملات میں انسان مجبور ہے اور بعض اختیاری معاملات میں مختار ہے۔

امت کے اولیائے کرامؒ کو بھی حق سبحانہ وتعالیٰ نے علم قدر کی حقیقت سے نوازا ہے تاہم یہ بات الگ ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں مکمل خاموشی اختیار کی ہے یا انتہائی علامتی لفظوں میں اشارات سے کام لیا ہے میں یہاں پر اپنی کوتاہ فہمی کا اقرار کرتے ہوئے حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربی کے افکار کو نہایت اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا حضرت شیخ نے اپنی مشہور عالم کتاب فصوص الحکم (مترجمہ شاہ محمد مبارک علی صاحب) کے فص حکمۃ روحیۃ فی کلمۃ یعقوبیۃ میں قدر اور سر قدر کے بارے میں تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے۔

فص مذکورہ میں حضرت شیخ رضی اللہ عنہ اپنی بات دین سے شروع فرماتے ہیں ان کے نزدیک دین کے دو پہلو ہیں (۱) عند اللہ اور (۲) عند المخلوق۔ شیخ کی تحقیق کے مطابق چونکہ حق تعالیٰ دین کو وضع کرتا ہے اس لئے اس کو عند اللہ کہا جاتا ہے جبکہ دوسری طرف مخلوق دین کی اطاعت کرتی ہے تو اسے شیخ عند المخلوق کے معنوں میں استعمال فرماتے ہیں اور نیز اس کے لئے انقیاد کی اصطلاح بھی استعمال فرماتے ہیں اور حق تعالیٰ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے دین کو ارفع اور بلند فرما دے۔ لہذا ان الدین عند اللہ الاسلام بالکل حق اور بجا طور پر فرمایا گیا ہے مگر اسی اسلام میں رہبانیت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ یہ دین بدلہ (جزاء) ہے ان افعال کا جس سے خدا راضی یا ناراض ہوتا ہے دراصل حضرت شیخ اکبر رضی اللہ عنہ اس سے یہ ثابت فرماتے ہیں کہ یہ دین کا ظاہر ہے دراصل حضرت شیخ اکبرؒ اس سے یہ ثابت فرماتے ہیں کہ یہ دین کا ظاہر ہے جبکہ اس کا ایک باطن

یعنی سر (جس کو شیخ سر قدر کے نام سے بھی موسوم فرماتے ہیں) بھی ہے وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ علمائے باطن کو اس کا علم ہوتا ہے اگر چہ وہ اس کا اظہار نہیں فرماتے۔

دین کے باطن یا سر قدر کے بارے میں شیخ فرماتے ہیں کہ چونکہ ممکنات اصلاً معدوم ہیں اور حقیقت میں صرف ذات حق ہی موجود ہے لیکن یہی ممکنات اعیان ثابتہ کی صورت میں ذات حق میں پائے جاتے ہیں ان اعیان ثابتہ میں کچھ استعداد اور قابلیت بھی پائی جاتی ہے تو یہی اعیان حق تعالیٰ سے اپنی قابلیت واستعداد کے مطابق جو بھی درخواست التجا یا مطالبہ کرتے ہیں وہی خارج میں ظاہر ہو جاتا ہے گویا دوسرے الفاظ میں عین خارجہ عین ثابتہ کا ظہور ہوتا ہے۔ یہاں پر نکتہ یہ ہے کہ حضرت شیخ یہ ثابت فرمانا چاہتے ہیں کہ لطف ولذت بھی ایک شخص خود ہی حاصل کرتا ہے اور دکھ والم بھی خود ہی سہتا ہے۔ کیوں؟ تو اس لئے کہ وجود حق سے وابستہ اعیان ثابتہ کا تقاضہ یا مطالبہ بھی حق تعالیٰ سے یہی ہوتا ہے۔ یعنی چونکہ اعیان ثابتہ اپنے منشا یا مطالبے کو پورا کرنے کے تعاقب میں ہوتے ہیں چنانچہ اسی کو حضرت شیخ نے جزاء کی عقوبت کا نام دیا ہے اور یہاں پر شیخ باطن اور ظاہر کا فرق بھی روشنی میں لاتے ہیں اور فرماتے ہیں سمی عقوبة وقابا و هو سائغ فی الخیر و الشر غیر ان العرف سماه فی الخیر ثوابا و فی الشر عقابا (اور اسی کا نام عقوبت جزاء رکھا گیا ہے اور خیر وشر کے لحاظ سے جزاءعقوبت کا استعمال جائز ہے اور شریعت نے خیر کے لئے ثواب اور شر کے لئے عقاب کی اصطلاحات استعمال فرمائی ہیں۔

بعد ازیں حضرت شیخ ارادہ اور علم الٰہی جل مجدہ کا ذکر بھی فرماتے ہیں اور ان کا مطلب تقریباً وہی ہے جو زیر مطالعہ کتاب جبر واختیار کے ایک اہم کردار مولوی احمد کی زبانی ادا ہوا ہے اور وہ یہ کہ اگر ارادہ الٰہی کے ساتھ علم الٰہی بھی شامل ہو تو یہ امر تکوینی کہلائے گا اور اگر علم حق کے ساتھ ارادہ الٰہی شامل نہ ہو تو یہ امر تکلیفی یا تشریعی ہوگا تاہم حضرت شیخ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ارادہ الٰہی کا کسی کو بھی علم نہیں ہوتا ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ خود ہی اپنے کسی برگزیدہ بندے کو آگاہ فرما دے۔

اس ساری بحث کا لب لباب یہی کہ جس طرح شیخ کا عقیدہ ہے کہ: لیس وجود الا وجود الحق یعنی حق تعالیٰ کے وجود کے سوا کوئی اور وجود نہیں ہے تو اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وجود اس کا علم اس کا، حکم بھی اس کا ارادہ بھی اس کا اور حضرت شیخ نے تو یہاں تک فرمایا دیا ہے کہ من یلتذ و من یتالم۔ یعنی ایک شخص لذت بھی خود ہی حاصل کرتا ہے اور الم بھی مگر یہاں پر وہی عارف جامی کی بات کہ ہر مرتبۂ وجود حکم دارد اور بقول حافظ شیرازی ادب کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے کیونکہ نبی بھی اس کا فرستادہ ہوتا ہے اور نبی جو دین لاتا ہے وہ بھی اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔

بر سبیل تذکرہ میں زیر نظر کتاب ''جبر واختیار'' کے اردو ترجمہ کے متعلق بھی کچھ عرض کرنے کی جرات کرتا ہوں یہ بھی تذکرہ ستاریہ اور تجلیات محمدی کی طرح ایک دقیق عنوان پر تحریر شدہ کتاب ہے اور اس حقیر وفقیر نے اپنی طرف سے کوشش کی ہے کہ ترجمہ مصنف کے مطلب کے مطابق ہو آسان بھی ہو اور ہموار بھی ہو۔ پھر بھی مشکل مقامات کی وضاحت اس بے ہیچ نے مختصر الفاظ میں قوسین کے اندر کی ہے مختصر یہ کہ کوشش کی گئی ہے کہ کسی قاری (چاہے وہ دسویں جماعت کا طالب علم ہو) کو پڑھنے اور سمجھنے میں دقت نہ ہو اور اگر یہ حقیر وفقیر اس مقصد میں کامیاب ہوا ہو تو للہ اپنی دعاؤں میں یاد فرمائیں۔

آخر میں جبر واختیار کی طباعت اور اشاعت کے سلسلے میں جناب مراد شنواری، کلیم شنواری، فیصل عمر شنواری، ڈاکٹر محمد سلیم چشتی، نظامی، نیازی ڈاکٹر ملک مسعود چشتی نظامی، نیازی، حاجی سعد اللہ شاہ، ملک جاوید، محمد نواز خان محمد سہیل نواز، حاجی سردار غلام جان، سید گلاب حسین، سید سیف علی شاہ، حسن علی شاہ اور گل محمد بیتاب، صفدر خان، سید اشرف، بشیر حسین اور سید تاج الدین کا بے حد شکر گزار ہوں اس لئے کہ اس حقیر کو ہر مرحلے پر ان کرم فرماؤں کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ حق تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر سے نوازے۔

آمین ثم آمین۔

حقیر وفقیر

طاہر بخاری

موضع لاہور۔ ضلع صوابی

جمعرات ۲۸ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ

مطابق

۲۱ جون ۲۰۰۱ء

بوقت دس بجکر بیس منٹ

# تعارف

محمد اشرف نے ابھی ابھی بی اے کیا تھا۔ اسی دوران میں اس کے والد علی احمد خان بیمار ہو گئے ان کو ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ علاج معالجہ ہوتا رہا مگر بچ نہ سکا اور فوت ہو گیا۔ محمد اشرف اپنے والد کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور اب اس کے کندھوں پر ایک بہت بڑی جائیداد کی ذمہ داری آن پڑی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ایم اے میں داخلہ نہ لیا۔ کیونکہ اب اس کا ارادہ یہ تھا کہ پرائیویٹ طور پر ایم اے کرے۔ کیونکہ والد کی وفات کے بعد اسے سر کھجانے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ علی احمد خان کا ارادہ تھا کہ جونہی محمد اشرف بی اے پاس کرے گا اس کی شادی کرا دی جائے گی۔ کیونکہ اس کی منگنی ایک سال قبل ہو گئی تھی۔ مگر شادی ان کے مرنے کی وجہ سے رک گئی۔ ویسے بھی بندے اور خدا کے ارادوں میں فرق ہوتا ہے۔ اشرف نے جائیداد کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اگرچہ اس کے والد کا رویہ بھی دہقانوں اور دیگر نوکروں سے بہت اچھا تھا۔ مگر اشرف کی دلی خواہش تھی کہ اپنے دہقانوں اور نوکروں کا معیار زندگی مزید بہتر کر دے۔ اس نے دنیا بھر کے ملکوں کے سیاسی معاشی اور اقتصادی حالات کا پورا پورا مطالعہ کیا تھا اور جاگیرداروں کے جبر و استبداد کا اسے علم تھا اور وہ بڑی حد تک اس کا مخالف تھا۔ چنانچہ اس کی جو جو زمینیں دہقانوں کو آدھی بٹائی پر دی گئی تھیں۔ محمد اشرف نے تیسرے حصہ کی بٹائی پر اکتفا کر لیا۔ اس طرح کہ دو حصے فصل دہقانوں کو دیتا اور ایک حصہ خود لیتا۔ اس نے اپنے نوکروں کی تنخواہوں میں معقول اضافہ کیا علاوہ ازیں کچھ زمین اپنے پاس رکھ لی اور نوکروں کی مدد سے اس میں بذات خود کاشت شروع کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوکروں اور دہقانوں کی اس کے ساتھ ایک قسم کی عقیدت اور محبت پیدا ہو گئی۔ اس حد تک کہ وہ سب محمد اشرف کے لئے جان دینے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ دراصل وہ ان سب کی شادی غمی کی تقریبات میں باقاعدہ

شریک ہوتا۔ چنانچہ تھوڑے سے عرصہ میں وہ سب مطمئن اور خوشحال ہو گئے۔

والد کے چالیسویں کے بعد اس نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے مشورہ پر شادی کر لی۔ اس کے بعد اس نے اپنا معتد بہ وقت مطالعہ کے لئے وقف کر دیا۔ اس نے ایک چھوٹی سی لائبریری بھی بنائی جس میں سینکڑوں بہترین کتابیں موجود تھیں۔ اس کے دوستوں کا حلقہ بے حد وسیع تھا۔ اس کے اکثر دوست رات کو اس کے حجرے میں جمع ہوتے اور مل بیٹھ کر مختلف موضوعات پر بحث کرتے تھے۔ اس کے دوستوں میں مختلف خیالات اور آراء رکھنے والے افراد موجود تھے۔ مگر نظریاتی اختلافات رکھنے کے باوجود وہ سب اپنی دوستی میں فرق نہ آنے دیتے۔ مثال کے طور پر مولوی احمد اور فلسفی اکرم ایک دوسرے پر شدید ترین حملے کرتے مگر دوسرے دن پھر دو شیر و شکر ہوتے۔ ڈاکٹر اکرم نے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ مذہب کا مخالف تھا۔ خدا کی ہستی کو بھی نہ مانتا تھا۔ لیکن اس کی مخالفت کا طریقہ انتہائی شائستہ اور تعمیری تھا۔ محمد اشرف کے ایک اور دوست کا نام داؤد تھا اور "سب کچھ خدا کرتا ہے" اس کا تکیہ کلام تھا۔ گویا وہ جبر کا نظریہ رکھتا تھا۔ مگر اشرف ہمیشہ اس کی سخت ترین مخالفت کرتا۔ کیونکہ وہ انسان کو مکمل طور پر مختار سمجھتا تھا۔ گویا وہ معتزلہ حضرات کا عقیدہ رکھتا تھا۔ تاہم اس کے دوستوں میں اکبر نامی ایک صوفی بھی تھا۔ اور جب احباب کے درمیان بحث گرم ہوتی تو وہ خاموشی اور انتہائی غور سے ان کی باتوں کو سنتا۔

# پہلی مجلس

ایک رات کو اشرف نے اپنے صوفی دوست اکبر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا!

اشرف: ''صوفی صاحب! آپ سے تو ہم کچھ بھی نہ سن سکے۔ کچھ تو ارشاد فرمائیے!

اکبر: (مسکرا کر) ذاتی طور پر میں دوستوں کو سماعت کرنے کا شوقین ہوں۔ کیونکہ میرے مسلک میں بحث ومباحثہ اور مناظرہ کا کوئی جواز نہیں۔

اشرف: ''آخر کیوں''

اکبر: (گلا تازہ کرتے ہوئے) ''خان! وہ ایسے کہ بحث کے دوران ہر دو جانبین اس کوشش میں ہوتے ہیں کہ اپنے مخالفت پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرکے اس کو خاموش کردے اور اس ترکیب سے اپنی علمی اور عقلی برتری ثابت کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔ مگر میرے نزدیک ایسا کرنے سے قلوب پر سیاہی آجاتی ہے اور باہم دگر رنجش اور کدورت پیدا ہوجاتی ہے۔''

اشرف: ''نہیں صوفی صاحب! ہم کبھی ایسی بحث میں نہیں الجھتے جس کی وجہ سے کسی دوسرے شخص کے احساسات اور جذبات کو ٹھیس یا صدمہ پہنچتا ہو۔''

مولوی احمد: اکبر صاحب! آپ تو عموماً یہاں آتے رہتے ہیں، ہماری باتوں کو سنتے ہیں مگر فرمائیے کبھی کسی موقع پر بھی آپ نے محسوس کیا ہے کہ ہم ایک دوسرے پر اپنی علمی برتری قائم کرنا چاہتے ہیں؟

اکبر: مولوی صاحب! یہ تو درست ہے کہ ابھی تک ایسا موقعہ نہیں آیا مگر ہوسکتا ہے کہ.....

اشرف: (صوفی کی بات کاٹ کر) انشاءاللہ ایسا موقع آئندہ بھی نہیں آئے گا کہ ہماری علمی تحقیقات خدانخواستہ جارحانہ اور متعصبانہ رنگ اختیار کرے۔

مولوی احمد: صوفی صاحب! اس بات کا ایک واضح ثبوت یہ ہے اور جیسے کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک ملا ہوں اور ہمارا معزز دوست مکرم خان عموماً مذہب کی مخالفت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا کے وجود کو ماننے سے بھی انکار کر لیتا ہے مگر میں نے کبھی برا نہیں مانا۔ اس لئے بھی کہ بالفرض وہ مخالفت کرتا بھی ہے تو اس کا تیور تعمیری ہوتا ہے اور دوسری اہم بات یہ کہ وہ عام ملاحدہ کی طرح ذات خداوندی کے بارے میں نامناسب الفاظ استعمال نہیں کرتا۔

داؤد: (بہرحال) میں تسلیم کرتا ہوں کہ باری تعالیٰ کی ہستی کا انکار بھی عین ذات الٰہی کی رضا کے مطابق ہوا کرتا ہے۔ اس لئے کہ اگر ایسا کرنے میں رضائے الٰہی شامل نہ ہوتی تو وہ کبھی ہستی باری تعالیٰ کا منکر نہ ہوتا۔

(دریں اثناء ایک خادم چائے لا کر ایک میز پر رکھ دیتا ہے۔ چائے نوش کرنے کے دوران تھوڑی دیر کے لئے خاموشی رہی۔ اشرف نے دوبارہ بات شروع کی اور کہا)

اشرف: ہمارے عوام کی ایک روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ جب ایک مجمع میں شریک افراد بات چیت کرنے میں مصروف ہوں اور دوران گفتگو...... خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ آ جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس مجمع پر کسی دیو کا سایہ پڑ جاتا ہے۔

(یہ بات سن کر سب دوست ہنسنے لگے)

داؤد: جہاں تک ہمارے عوام کا تعلق ہے تو سچی بات یہ ہے کہ وہ بڑے مزے کی زندگی گزارتے ہیں وہ بہ شدت تمام اپنے عقیدے کے پابند ہوتے ہیں اور شکوک و

شبہات سے بے فکر ہوتے ہیں۔

مولوی احمد: یہ درست ہوگا۔مگر قرآن حکیم نے ایسے لوگوں کو کالانعام سے یاد فرمایا ہے یعنی جانوروں کے سے لوگ!

داؤد: آپ جو کچھ بھی سمجھیں۔میرے خیال میں زندگی کا لطف ہمارے عوام ہی اٹھا رہے ہیں۔

اکرم: ہاں!اور یہاں ہم (پڑھے لکھے) لوگوں کی یہ حالت ہے کہ

اے روشنئ طبع تو بر من بلا شدی

کے مصداق ہمارا علم اور ہماری عقل ہی ہمارے لئے بلائے بے درمان بن گئی ہے۔

مولوی احمد: بلا تجھ بے درمان آپ کے لئے ہوگی اس لئے کہ فلسفہ کی موشگافیوں نے آپ کو تقریباً ابتر کر دیا ہے چنانچہ ہر ایک نظریہ کو شک کی نگاہ سے دیکھتے اور انکار کے کانوں سے سنتے ہو۔

اکرم: ملا صاحب! گستاخی معاف! بات یہ ہے کہ جب تک ایک آدمی تشکیک کے دور سے ہو کر نہ گزرے تب تک یقین کی دولت ہر گز ہاتھ نہیں آتی بلکہ جو شخص شک کا شکار نہ ہو اُسے یقین بھی نہیں آتا۔

مولوی احمد: (دراصل) ایک فلسفی اپنی بے پناہ دانائی اور عقلمندی کے سبب نادان بن جاتا ہے جیسے ایک شاعر نے کہا ہے

نظر تت شی چہ رناشی ترحد تیرہ

عقل مند لہ ڈیرہ عقلہ تیر وتے شی

(چکا چوندھ روشنی جب حد سے گزر جاتی ہے تو نظر کو خیرہ کر دیتی ہے۔(بالکل اسی

طرح) ایک انتہائی عقل مند شخص کو بھی اس کی اپنی عقل دھوکا دے سکتی ہے)

اکرم: آخر ایک فلسفی بھی انسان ہوتا ہے اور غلطی انسان سے ہوا کرتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس کے علم و دانش اور فلسفے کی اہمیت سے انکار کیا جائے۔

مولوی احمد: بھائی صاحب! میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ فلسفی عموماً پاگل (دیوانے) ہو جایا کرتے ہیں اور بعض کی حالت تو یہ ہو جاتی ہے مثلاً ایک فلسفی کے متعلق مشہور ہے کہ کسی راستے پر سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ کسی عورت نے دیوار پر اوپلے رکھے ہیں۔ چنانچہ فلسفی یہ دیکھ کر ششدرر رہ گیا اور اسی فکر میں ڈوب گیا کہ آخر یہ گوبر دیوار کے اوپر کیسے پہنچ گیا۔ وہ حیران تھا کہ گائے یا بھینس نے کیسے چڑھ کر دیوار کے اوپر گوبر کر دیا؟

(یہ بات سماعت کر کے سارے دوست ہنسنے لگے تاہم اکرم نے جواباً کہا)

اکرم: شاید یہ لطیفہ بھی کسی ملا نے گڑھ لیا ہو؟ کیونکہ ایک فلسفی ایسی لایعنی باتوں سے بہت بلند ہوتا ہے۔ کیا اسے یہ بھی معلوم نہ ہوگا گوبر کے اوپلے انسان بناتا اور دیوار پر تھوپتا ہے؟

مولوی احمد: میرا مطلب یہ ہے کہ دینی فکر کے بغیر فلسفہ نری زندیقیت ہے۔

اکرم: اب میری بھی سنیں۔ کہ بذات خود دین بھی بدون عقل اور فلسفے کے۔ دین نہیں بلکہ پاگل پن کے مترادف ہوگا۔ کیا خود قرآن حکیم نے بار بار یہ دعوت نہیں دی ہے کہ تم لوگ عقل سے کیوں کام نہیں لیتے؟ دراصل یہی عقل ہی تو فلسفہ ہے ورنہ آپ بتائیں کہ دین معقولات سے کیا خالی ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے سمجھانے کے لئے مثالیں نہیں دی ہیں؟

ڈاکٹر مکرم: مولوی صاحب: اکرم کی بات وزن دار ہے۔

اشرف: اس معاملے میں، میں بھی ڈاکٹر صاحب کی تائید کرتا ہوں۔

اکرم: مسلمانوں میں بھی ایسے فلاسفر گزرے ہیں۔ جن کی تخلیق کردہ کتب ایک لمبے عرصے تک یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں بطور لازمی تعلیمی نصاب شامل تھیں۔ شیخ بوعلی سینا کی القانون اور اسی طرح دیگر کتب یورپی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔

اکبر: اکرم کی بات درست ہے طبقہ صوفیا، میں بھی شیخ اکبر محی الدین ابن العربی (رضی اللہ عنہ) بذات خود ایک بہت بڑے فلسفی تھے۔

ڈاکٹر مکرم: حیرت ہے کہ شیخ اکبرؒ جیسے متصوفانہ ذہن رکھنے والے شخص نے فلسفہ سے کیونکر رشتہ جوڑلیا؟

اکبر: ڈاکٹر صاحب! (بات یہ ہے) کہ جب انسانی قلب ودماغ حق تعالیٰ کے وجود کا ادراک کرلے تو اس وقت فلسفہ اور تصوف ہر دو ایک دوسرے سے متفق ہوجاتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ فلسفہ اور تصوف یا بہ الفاظ دیگر صوفی اور فلسفی دونوں متفکر ہوتے ہیں۔ البتہ صوفی نفس کی باریکیوں اور حق تعالیٰ کی مخلوق کے بارے میں فکر سے کام لیتا ہے اور فلسفی کائنات عالم اور اس کی غایت کے متعلق فکر کرنے میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ اگرچہ ایک فلسفی کی بہ نسبت ایک ماہر نفسیات زیادہ متصوف ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ایک فلسفی عموماً کلیات کے بارے میں سوچتا ہے مگر ایک صوفی کلیات کے ساتھ ساتھ جزیات کے بارے میں بھی فکر سے کام لیتا ہے۔

ڈاکٹر مکرم: میں بزعم خود نہ تو تصوف کا انکار کرتا ہوں اور نہ ہی اس کی تائید کرتا ہوں۔ البتہ جہاں تک انسانی حواس کا تعلق ہے تو (بظاہر) ایک انسان حواس کے بغیر بلند پرواز پر قادر نہیں ہوسکتا نہ ہی حواس کے بغیر کسی چیز کا ادراک کرسکتا ہے۔

صوفی اکبر: ڈاکٹر صاحب! حواس سے آپ کا مطلب کون سے حواس ہیں؟

ڈاکٹر مکرم: یہی معروف پانچ حواس یعنی دیکھنا' سننا' چکھنا' سونگھنا اور مس کرنا یعنی باصرہ' سامعہ' ذائقہ' شامہ اور لامسہ۔

اکبر: ڈاکٹر صاحب! یہ تو ہوئے ظاہری حواس۔ مگر آپ باطنی حواس حس مشترک' قوت متفکر' حافظ' قوت واہمہ اور حافظہ بھول گئے۔ کیونکہ یہی (باطنی حواس) ظاہری حواس کے ادراک کو ترتیب دیتے ہیں اور پھر مرتب و مرکب خیال کو وجدان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ بعد ازیں رد یا قبول کرنے کا فیصلہ اپنے وجدان کے مطابق انسانی انا کرتا ہے۔

اشرف: دیکھیے! صوفی اپنے اصولی روپ میں بات کرنے لگا ہے۔ خدا نے چاہا تو اب بحث میں مزید لطف آئے گا۔

اکبر: (مسکراتے ہوئے) آخر کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی پڑتا ہے ایسی محفل میں ایک انسان خاموش کیسے رہ سکتا ہے؟

ڈاکٹر مکرم: صوفی صاحب! آپ کی گفتگو سے ہم محظوظ ہوئے۔ اب مہربانی فرما کر یہ بتا دیجیے کہ ''انا'' یا ایگو (Ego) کیا چیز ہے؟

اکبر: ''انا'' انسان کا وہ بنیادی عنصر ہے جس کو نفس ناطقہ یا روح کہا جاتا ہے اور جو جسم انسانی کے برعکس تغیر اور تحول سے قطعی طور پر پاک ہے۔

ڈاکٹر مکرم: تو گویا آپ کے خیال میں انسانی انا۔ جسم انسانی کی طرح متغیر نہیں ہوتی حالانکہ انا یا نفس یا روح (جو کچھ بھی اسے کہیں) وجود انسانی کے مختلف جوارح کی اجتماعی کیفیت کو کہتے ہیں جو تغیر سے خالی نہیں۔

اکبر: اگر آپ کی بات کو مان لیا جائے۔ پھر تو ہم اپنے حاصل کردہ علم اور معلومات سے

بھی محروم ہو جائیں گے۔ کیونکہ جو علم ہم حواس کے ذریعے حاصل کریں گے اور وہ حافظہ میں محفوظ ہوتا ہے تو مسلسل تغیر پانے یا متغیر ہونے کی وجہ سے بالیقین محو ہو جایا کرے گا۔ مثلاً آج میں ڈاکٹر صاحب کو اپنے آمنے سامنے دیکھتا ہوں نیز انہیں پہچانتا ہوں۔ لیکن اگر دس دنوں کے بعد ملاقات ہو تو نہ پہچان سکوں گا۔ اس لئے کہ حافظہ نے تحول اور تغیر کی وجہ سے سب کچھ ملیا میٹ کر کے ڈاکٹر صاحب کی شکل وصورت کو میرے حافظے سے محو کر دیا ہوگا۔

ڈاکٹر مکرم: صوفی صاحب! بات یہ نہیں کیونکہ علم تو تجربہ سے حاصل ہوتا ہے اور جب ہم بار بار ایک چیز کو دیکھتے ہیں تو ہمارا شعور اس کا عادی ہو جاتا ہے۔

اکبر: جہاں تک مادیاتی سوال کا تعلق ہے تو کہنے کی ضرورت نہیں کہ مادیات ہر لحظہ تحول اور تغیر پذیر ہوتی ہیں۔ اب اگر ہم انسانی حافظہ کو مادی چیز مان لیں اور اس پر مسلسل اشیاء کی صورتیں نقش ہوتیں تو (مادی تغیر وتحول کے سبب) وہ سب کے سب ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہوتیں کہ ان میں سے کسی ایک کی صورت بھی اپنی اصلی حالت پر نہ رہتی بہ ایں ہمہ ہم پھر بھی ہم اپنے حافظہ میں بے شمار اشیاء کی صورتوں کو محفوظ پاتے ہیں اور حیرت ہے کہ وہ سب ایک دوسرے سے خلط ملط نہیں ہوتے۔ بلکہ ہم اپنی مرضی کے مطابق اپنے قوت تذکر کو کام میں لا کر کوئی صورت نکال سکتے ہیں۔

اشرف: صوفی صاحب! اپنے اس دعوے کے متعلق کوئی ثبوت بھی پیش فرما دیجئے جس سے انکار کرنا ممکن نہ ہو۔

اکبر: میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ انکار ممکن نہ ہوگا۔ کیونکہ ایسی کوئی دلیل موجود نہیں جس سے انکار کی کوئی صورت نہ نکلتی ہو۔ البتہ جو دلیل میں پیش کرنے والا ہوں اس کو

انسانوں کی اکثریت معقول دلیل کا درجہ ضرور سمجھے گی۔ اور وہ یہ کہ مثلاً ریڈیو سے مشاعرہ نشر ہو رہا ہو۔ تو ظاہر ہے کہ شاعروں کی صدائیں پہلے فضا کی طرف جاتی ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ لطائف ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہوتے۔ گویا وہ فضا میں ایک آواز ہو جاتی ہیں لیکن جب ہم یہاں ان کو سماعت کرتے ہیں تو یہاں پر شاعر کی انفرادی آواز کو سنتے ہیں۔ مزید برآں جب کسی شاعر کو دیگر شاعر حضرات داد دیتے ہیں تو بحیثیت مجموعی ان تمام آوازوں میں۔ ایک ایک کر کے سب کی آوازوں کو بھی سن (اور پہچان) لیتے ہیں۔ چنانچہ اس دلیل کی رو سے معلوم ہوا کہ انائے انسانی تغیر و تحول کو قبول نہیں کرتی وہ بچپن سے لے کر بڑھاپے بلکہ مرتے دم تک بحال رہتی ہے۔ جب میں ابھی بچہ تھا تو اپنی ''میں'' (زہ) کو اس وقت بھی محسوس کرتا تھا اب جبکہ میری عمر پختہ ہو گئی ہے پھر بھی وہی ''میں'' (زہ) ہوں اور فی الحقیقت یہی ''میں'' (زہ) یا بہ الفاظ دیگر ''انا'' ہی اصل چیز ہے مثلاً ''میں'' فکر کرتا ہوں، تو معلوم ہوا کہ ''میں'' موجود ہوں اور یہی فکر اول سے لے کر آخر تک موجود رہتی ہے۔

ڈاکٹر مکرم: آپ کا یہ خیال کہ جب میں فکر کرتا ہوں تو معلوم ہوا کہ ''میں'' موجود ہوں۔ تو یہ صحیح ہے مگر اس دلیل سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ ہماری انا متغیر نہیں ہوتی۔ (فرض کیجئے) ایک سرجن آپریشن کے لئے ایک مریض کو بے ہوشی کی انجکشن لگاتا ہے اور آپریشن کے بعد جب وہی مریض ہوش میں آجاتا ہے تو آپریشن اور بے ہوشی کے دوران وقفے (یا حالت) کے متعلق اس مریض کو کچھ بھی یاد (شعور) نہیں ہوتا۔ (تو ثابت ہوا) کہ اگر ''انا'' تغیر پذیر نہ ہوتی تو لازمی تھا کہ مریض آپریشن کے دوران سرجن کے عمل کو محسوس کرتا۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ ''انا''

بھی اسی مادی جسم سے ہٹ کر کوئی الگ چیز نہیں ہے۔

اکبر: ڈاکٹر صاحب! بات یہ نہیں (بلکہ) جس وقت سرجن مریض کو بے ہوشی کا انجکشن لگاتا ہے تو اسی انجکشن کے اثر سے (مریض کا) دماغ موثر ہوجاتا ہے اور جب دماغ بے حس ہوجاتا ہے تو معاً باطنی حواس بھی معطل ہوجاتے ہیں۔ مگر انسانی انا ہرگز معطل نہیں ہوتی وہ جو کچھ محسوس کرتی ہے (انہی) حواس کے ذریعے محسوس کرتی ہے چونکہ اس وقت حواس معطل ہوتے ہیں تو ''انا'' کو آپریشن کے اعمال کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس دوسرا جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''انا'' سرجن کے ہر فعل کا باقاعدہ مشاہدہ تو کرتی ہے۔ لیکن چونکہ حواس تو معطل ہوتے ہیں اور اگر ''انا'' کی طرف سے حواس کو آپریشن کے اعمال کے پرتو پہنچتے بھی ہوں تو حواس ان کو محسوس نہیں کرتے اس لئے کہ وہ تو معطل ہی ہوتے ہیں۔

داؤد: دوسری دلیل وزن دار اور مجھے پسند ہے۔

اشرف: پہلی دلیل بھی کچھ کم وزن دار نہیں۔

ڈاکٹر مکرم: افسوس تو یہ ہے کہ میں جو بھی دلیل پیش کروں گا آپ لوگ اس پر یقین نہیں کریں گے۔ شاید اس لئے کہ آپ سب مذہب اور عقیدے کی قیود اور پابندیوں کی وجہ سے آزاد فکر کی نعمت سے محروم ہیں۔

اکرم: ڈاکٹر صاحب! احباب آپ کو (یہاں پر) یہ جواب بھی دے سکتے ہیں کہ مادیت نے آپ کے ذہن پر مکمل طور پر قبضہ جما لیا ہے (حالت یہ ہے کہ) اب آپ اسکے خلاف سوچ بھی نہیں سکتے اور جو عقائد آپ نے اپنا رکھے ہیں تو ہم ان کو بھی ایک ''مذہب'' ہی کہہ سکتے ہیں۔ دوسری جانب آپ بھی مجبور ہیں کہ اپنے عقائد کے خلاف کچھ تسلیم نہ کریں۔

اشرف: میں تو یہی محسوس کرتا ہوں کہ اس کے بعد تبادلۂ خیالات کی یہ بحث مجادلہ کا رنگ اختیار لے گی۔ رات بھی کافی گزر چکی ہے تو ما بقایا تبادلۂ خیالات آئندہ شب کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

(دیگر احباب نے بھی اس مشورہ کو پسند کیا اور اپنے اپنے گھروں کی راہ لی)

# دوسری مجلس

(شام کے بعد سب دوست اشرف کے حجرے میں آن ملے اور گپ شپ شروع ہوگئی)

اشرف: ہمارا عزیز دوست داؤد خان دوران گفتگو یہی کہتا ہے کہ ''سب کچھ خدا کرتا ہے'' جبکہ اس کے برعکس ہمارے دوسرے معزز دوست اسلم کا کہنا ہے کہ ''نہیں بلکہ سب انسان خود ہی کرتا ہے۔'' ظاہر ہے کہ جبر واختیار کا مسئلہ نسل بنی نوع انسان کی ابتداء سے لے کر آج تک متنازعہ رہا ہے اور اس بارے میں بہت سا اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ اس لئے اگر آج ہم اپنی گفتگو کا آغاز اسی مسئلہ سے کرلیں تو کیسا رہے گا؟

(چنانچہ سب دوستوں نے متفقہ طور پر داؤد سے درخواست کی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ معلوم ہوا کہ جیسے وہ پہلے ہی سے اس معاملہ کے لئے تیار تھا اس نے گفتگو کی ابتداء اس طرح سے کی):

داؤد: ہر وہ انسان جو اللہ تعالیٰ کے وجودِ برحق کا قائل ہو تو لازمی طور پر وہ کائناتِ عالم کو اس کی مخلوق تسلیم کرے گا۔ اس کے باوصوف وہ یہ بھی یقین رکھے گا کہ ذات کبریا۔ عالم' دانا و بینا ہے۔ اس نے اپنے علم کے مطابق ہر چیز کو ایک اندازے کے مطابق پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے انا کل شیئی حلقنهٗ بقدر (بے شک ہر چیز کو پیدا کیا ہم نے۔ ساتھ اندازے کے) تو ظاہر ہے کہ اسی آیت کی رو سے جس چیز کو حق تعالیٰ نے جس طرح تخلیق کیا ہے اور پھر جو جو اوصاف اس کے اندر رکھے ہیں تو (لامحالہ) اسی مخلوق سے انہی

اوصاف اور افعال کا صدور ہوگا (جو ان کو ودیعت کئے گئے ہیں) کیونکہ یہ تو ہرگز ممکن ہی نہیں کہ مخلوق ہو کر ان صفات کے خلاف عمل پیرا ہوں جو ان کی فطرت میں بنیادی طور پر موجود ہیں۔ اس لئے وہ مجبور ہوں گے کہ ان سے وہی (فطری) اعمال ظاہر ہوں۔ (سو) معلوم ہوا کہ انسان ''مجبورِ محض'' ہے۔

اسلم: داؤد خان! اب اگر میں تمہارے چہرے پر ایک تھپڑ رسید کر دوں تو اس پر تمہاری ناراضگی عبث ہونی چاہئے۔ کیونکہ یہ (بھی) خدا کو منظور ہوگا۔

داؤد: (مسکرا کر) اسلم خان! اگر اسی طرح میں بھی جواباً آپ کے چہرے پر ایک تھپڑ رسید کروں تو یہ میری مجبوری ہوگی۔

اسلم: (پھر) یہ تو عجیب خدا ہوا کہ آپ کو بھی تھپڑ مارنے پر مجبور کرتا ہے اور مجھے بھی! حالانکہ قرآن حکیم سے یہ ثابت ہے کہ انسان مکمل طور پر مختار یعنی صاحب اختیار ہے۔ فمن شاء فلیؤ من و من شاء فلیکفر یعنی ہر ایک کی مرضی ہے (اختیار میں ہے) کہ ایمان لے آئے یا اپنی مرضی سے کفر اختیار کرے۔ سورۃ کہف آیت ۲۹ اب فرمایئے آپ کی بات درست ہے یا میری؟

داؤد: لیکن میں آپ کی توجہ اس آیت کریمہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ جو ارشاد فرمایا گیا ہے و اللہ خلقکم و ما تعملون یعنی بے شک ہم نے تم کو بھی پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو بھی پیدا کیا۔

اسلم: لیکن قرآن مجید میں تو یہ بھی فرمایا گیا ہے مااصابکم من مصیبۃ فما کسبت ایدیکم ۔ الشوریٰ آیت ۳۰ (اور تم کو اے گنہگارو جو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے)

داؤد: لیکن قرآن حکیم میں تو یہ ارشاد بھی موجود ہے مااصاب من مصیبۃ الا باذن

اللہ سورۃ تغابن آیت ۱۱ (یعنی نہیں پہنچتی کوئی مصیبت مگر اللہ کے حکم سے) اب فرمایئے!

ڈاکٹر مکرم: ارے صاحب! کیا ہمیں بھی اس بحث میں بولنے کی اجازت ہے؟

اشرف: کیوں نہیں ڈاکٹر صاحب! ہر ایک کو اجازت ہے۔ تو فرمایئے!

ڈاکٹر مکرم: (بات یہ ہے کہ) ہر دو برادران نے قرآن مجید سے دلائل پیش کئے ہیں۔ مگر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا آپ کو ان دونوں حضرات کے دلائل میں صاف طور پر اختلاف نظر نہیں آتا؟

مولوی احمد: حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَلَو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرا یعنی اگر یہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پایا جاتا۔

ڈاکٹر مکرم: لیکن اختلاف تو بالکل واضح ہے۔

مولوی احمد: (فی الحقیقت) یہ اختلاف نہیں اور یہ وضاحت طلب ہے۔

اشرف: مولوی صاحب آپ خاطر جمع رکھیں آپ کو وضاحت کے لئے وقت دیا جائے گا۔ فی الحال داؤد اور اسلم کو موقع دیتے ہیں کہ بحث کو آگے بڑھائیں۔

اسلم: اچھا تو داؤد خان! جب سب کچھ خدا خود ہی کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ سب کو ہدایت بھی وہی دے گا اور سب گمراہوں کو گمراہ بھی وہی کرے گا!

داؤد: بالکل! قرآن بھی یہی فرماتا ہے من یھد اللہ فھو المھتدی و من یضلل فاولئک ھم الخاسرون ۔ یعنی جس کو اللہ ہدایت کرتا ہے سو ہدایت پانے والا ہی ہوتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دے سو ایسے ہی لوگ (ابدی) خسارہ میں

ہیں۔سورۃ اعراف آیت ۱۷۸

اسلم: تو سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو کس لئے بھیجا؟ پھر تو وہ خود ہی کسی کو گمراہ کرتا اور کسی کو ہدایت دیتا۔جیسے بقول آپ کے وہ کرتا رہا ہے۔

داؤد: یہ سب کچھ اسی کی رضا پر منحصر ہے۔ارشاد ہوا ہے کہ فعال لما یرید الرعد آیت ۳۸۔خدا تعالیٰ (ہی) جس حکم کو چاہیں موقوف کر دیتے ہیں اور جس حکم کو چاہیں قائم رکھتے ہیں۔

اسلم: تو کیا یہ ظلم نہ ہوگا کہ قتل، ڈاکہ اور دوسرے افعال تو (ایک شخص پر) خود خدا کراتا ہے اور پھر سزا بھی دیتا ہے؟

داؤد: نہیں۔ظلم تو اس صورت میں ہوتا کہ (وہ) کسی اور کے ملک میں دخل اندازی کرتا (جبکہ) یہ سب کچھ اس کی مخلوقات ہیں اور جو کچھ وہ چاہتا ہے کر گزرتا ہے اور نیز کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس (مالک) پر اعتراض کرے۔قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس سے کچھ پوچھنے کا کسی کو کوئی حق حاصل نہیں۔ہاں! اسے یہ حق حاصل ہے کہ دوسروں سے پوچھے۔

اسلم: یہ تعلیم کس حد تک عقل سلیم کے مطابق ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر ایک غیر مسلم یہ سب کچھ پڑھے تو وہ اسلام سے نفرت کرنے لگے گا۔

---

(۱) سورۃ مبارک الرعد میں ارشاد ہوتا ہے کہ قل ان اللہ یضل من یشاء و یھدی الیہ من اناب ٥ آپ کہہ دیجئے کہ واقعی اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گمراہ کر دیتے ہیں اور جو شخص ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کو اپنی طرف سے ہدایت کر دیتا ہے۔آیت ۲۷

(۲) سورۃ مبارکہ الرعد میں ارشاد الٰہی ہے ومن یُضلِلِ اللہ فما لہ من ھاد ٥ آیت نمبر ۳۳ ترجمہ یہ ہے (اور جس کو خدا تعالیٰ گمراہی میں رکھے اس کا کوئی راہ پر لانے نہیں۔اس طرح سورۃ مبارکہ الکھف میں ارشاد الٰہی ہے من یھد اللہ فھو المھتد ومن یضلل فان تجد لہ ولیا مرشدا ٥ ترجمہ: جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پاتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دیں تو آپ اس کے لئے کوئی مددگار راہ بتلانے والا نہ پائیں گے۔(سورۃ الکھف آیت نمبر ۱۷)

داؤد: لیکن اس کے باوجود بے شمار کافروں نے اسلام قبول کیا ہے اور اس سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ ہادئ برحق خداوند اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

اسلم: شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ میں مجبوراً مختار بنایا گیا ہوں۔ گویا اس نے انسان کو مختار تسلیم کیا ہے۔

داؤد: شاہ ولی اللہ کے قول سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان مجبور ہے۔ اس وجہ سے کہ اگر انسان کو اختیار دیا گیا ہے تو اس کی نوعیت بھی جبری ہے۔ چنانچہ انسان مجبور ہے کہ اس اختیار سے کام لے۔

ڈاکٹر مکرم: واہ داؤد خان! کمال کرتے ہو ایک طرف انسان کے مختار ہونے کے بھی قائل ہو اور دوسری طرف انسانی اختیار کو جبر سے بھی تعبیر کیا۔ واہ!

داؤد: اسی عنوان پر حمزہ (بابا) کا ایک شعر ہے فرماتے ہیں

اختیار دی حه ورکڑے و حمزه ته
چه ئے دے د اختیار په آئینه کرد

ترجمہ: اے خدا! جس نوعیت کا اختیار تو نے حمزہ کو دیا ہے تو وہی اختیار اس کے اختیار کے آئینہ پر گرد کے مصداق ہے۔

اسلم: یہ شعر شاہ ولی اللہؒ کے قول کی ترجمانی کرتا ہے۔ البتہ جن اقوام نے انسان کو مجبور محض تسلیم کیا ہے وہ بشری ارتقاء کے سلسلے میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور دوسری قوموں نے ان کو اپنا غلام بنا دیا ہے۔ خصوصاً ایشیائی اقوام کی تاریخ گواہ ہے کہ چونکہ وہ جبر کا عقیدہ رکھتے ہیں چنانچہ سب مغربی اقوام کے غلام بن گئے۔ اس موقعہ پر مجھے فارسی کا ایک شعر یاد آ گیا

تو ے بہ جدوجہد گرفتند وصل دوست

قو مے دگر حوالہ بہ تقدیر میکنند

ایک قوم کوشش اور جدوجہد کے ذریعے وِصالِ یار کی دولت حاصل کرتی ہے اور دوسری قوم اس معاملہ کو تقدیر کے حوالے کر دیتی ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وصال دوست کی دولت میری قسمت میں ہوگی تو خود بخود مل جائے گی چنانچہ اس کے لئے کوشش فضول ہے اس لئے کہ اگر ایک چیز قسمت ہی میں نہ ہو تو کوشش کیا کر سکتی ہے؟ اس کی تائید قرآن مجید اس طرح سے کرتا ہے لیس للانسان الا ماسعیٰ انسان کے لئے وہی کچھ ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔ تاہم جب تک ہمارے اگلے وقتوں کے مسلمانوں کے دلوں میں جہاد اور کوشش کا جذبہ موجود تھا تو دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ پر حکمرانی کرتے تھے مگر جب وہ عیش وعشرت میں کھو گئے اور ان کے دلوں پر موت کا خوف چھا گیا تو نتیجے کے طور پر یورپ کے غلام بن گئے۔ ضمناً ایک تاریخی واقعہ کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ جونہی بنو امیہ نے ملک پر قبضہ جما لیا اور اپنے مخالفین کو بلا امتیاز قتل کرنا شروع کر دیا تو اسی اثناء میں ایک شخص نے حضرت امام حسن بصریؒ سے پوچھا کہ بنی امیہ مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہو رہا ہے کیونکہ اگر یہ خدا کی رضا نہ ہوتی۔ تو ہم ان کو قتل کرنے پر کیسے قادر ہوتے؟ حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے جواب دیا کہ وہ اللہ کے دشمن، جھوٹ بولتے ہیں۔ حق تعالیٰ کبھی کسی بے گناہ کے قتل پر راضی نہیں ہوتا۔ تو داؤد خان! فرمایئے یہ قتل خدا کرتا ہے؟

داؤد: دراصل یہ سب کچھ پہلے سے ہی مقرر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور جو کچھ اس نے مقرر فرمایا ہے وہ حکمت سے خالی نہیں۔ یعنی یہ جو کچھ ہوا ہے، ہو رہا ہے یا جو

کچھ آئندہ ہوگا۔ سب کچھ خدا کے علم میں ہے اس عالم کی مثال ایک گھڑی کی سی ہے جس کو ایک مخصوص وقت کے لئے چابی دی گئی ہے اور گھڑی چل رہی ہے۔ البتہ ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تقدیر کو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی بدلا سکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ یمحو اللہ ما یشاء و یثبت مٹا ڈالتا ہے جو چاہتا ہے اور باقی رکھتا ہے الرعد آیت ۳۹۔ یا یہ کہ وَاللہ غالب علیٰ امرہ ۔(اور اللہ غالب ہے اوپر اپنے کام اپنے کے ) یوسف آیت ۲۱۔ انسان صرف اتنا کرسکتا ہے کہ اپنی مقررہ قید میں کچھ نہ کچھ اطمینان اور خوشحالی پیدا کرسکتا ہے۔

اسلم: اگر یہی بات ہوتو پھر آپ کسی نہ کسی شکل میں انسان کے مختاری کے قائل ہوں گے۔ مگر میں (یہی) کہوں گا کہ انسان مکمل طور پر مختار ہے اس وجہ سے کہ فی الاصل انسان بھی ایک حیوان ہے' حیوان ایک نوع ہے اور اس کے بے شمار انواع ہیں۔ چنانچہ مادی حیثیت سے انسان بھی دیگر حیوانوں کی طرح ایک حیوان ہے۔ لیکن انسان جس روح سے نوازا گیا ہے (وہی روح) عقل اور شعور کا مالک ہے اور بدیں وجہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہے۔ بات یہ ہے کہ کوئی مادی چیز اپنی فطری تقاضوں کے خلاف نہیں چل سکتی۔ (وہ تقاضے) جو اس جہاں میں پیش آتے ہیں ۔حیوان کو جب پیاس لگتی ہے تو پانی پر ٹوٹ پڑتا ہے ۔جب اسے بھوک لگتی ہے اور اپنی غذا کو دیکھ لیتا ہے تو اضطراری طور پر کھانے لگ جاتا ہے۔ لیکن وہ حیوان ناطق ہے کہ اگر اسے پیاس لگ جائے تو بھی پانی نہیں پیتا اور اگر اسے بھوک لگ جائے تو بھی کھانا نہیں کھاتا۔ اس کی مثال مسلمانوں کا روزہ ہے جو آپ سب کو بخوبی معلوم ہے۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ انسان مختار ہے۔ کیونکہ

دراصل اس کے وجود میں ایک ایسا جوہر موجود ہے جو اس مادی جہاں کا جزو نہیں
ہے اور اگر وہ عنصر مادی ہوتا تو قطعی طور پر قانون فطرت کی خلاف ورزی نہ کرتا۔
اس سلسلے میں آپ سب کی اجازت سے ایک واقعہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں
۔میں نے کسی کتاب میں ایک صوفی بزرگ کا قصہ پڑھا ہے کہ اپنے مجاہدے کے
دوران اس نے ایک لومڑی کو دیکھا جس کی چاروں ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں اور وہ
اپنی جگہ پر پڑی تھی۔ یہ دیکھ کر صوفی بزرگ سوچنے لگا کہ جب یہ لومڑی چل پھر
نہیں سکتی تو کھائے گی کہاں سے اور کیسے! وہ اسی فکر میں تھا کہ اچانک اس نے
ایک دھاڑتے ہوئے شیر کو دیکھا یہ شیر ایک ہرن کو شکار کرنا چاہتا تھا اس طرح کہ
ہرن آگے اور شیر اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔صوفی درمیان سے ایک طرف
ہوگیا۔شیر نے ہرن کو شکار کرلیا خود پیٹ بھر کر کھالیا۔بعد ازاں اچھا خاصا
گوشت لنگڑی لومڑی کی طرف لڑھکا دیا۔رینگ کر لومڑی آگے بڑھی اور گوشت
کی دعوت اڑانے لگی۔پیٹ بھر کر کھانے کے بعد لومڑی نے گردن لمبی کر کے سر
اٹھالیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔صوفی بزرگ سمجھا کہ اب یہ لومڑی پیاس بجھانے کی
فکر میں ہے لیکن قرب وجوار میں پانی دستیاب نہ تھا۔اسی اثناء میں بالکل سامنے
پہاڑ کی چوٹی کے اوپر بادل دکھائی دیئے اور ایک آن میں گرج چمک کے ساتھ
بارش شروع ہوگئی۔پہاڑ کے اوپر سے بارش کے پانی نے سیلاب کی شکل اختیار کی
جو لومڑی کی طرف آرہا تھا۔رینگ رینگ کر وہ وہاں پہنچی اور پانی پی لیا۔بعد
ازاں شکرگزار لومڑی نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور اطمینان کا ایک نعرہ
بلند کیا۔گویا وہ خدا کا شکر ادا کررہی تھی۔صوفی نے جب یہ حالت دیکھی تو سوچنے
لگا کہ وہ روزی کے لئے ناحق محنت اور کوشش کرتا ہے جبکہ خدا ہر ایک کو روزی دیتا

ہے۔ چنانچہ پہاڑ کے دامن میں ایک مقام پر بیٹھ گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ خدا تعالیٰ ضرور اس کی روزی، ہلے جلے بغیر پہنچائے گا۔ مگر مسلسل دو دن تک کچھ نہ ملا اور وہ بھوکا پیاسا رہا۔ آخر فریاد کے طور پر خدا سے عرض کیا کہ "اے اللہ! لنگڑی لومڑی کو تو روزی پہنچاتے ہو مگر اپنے ایک بندے کو بھلا دیا ہے" اس وقت اس کے وجدان نے آواز محسوس کی کہ اے نادان انسان! لومڑی تو لنگڑی (شل) تھی وہ اپنی روزی کے لئے چل پھر نہیں سکتی تھی اس لئے اس کا کفیل میں ہوں۔ مگر (برعکس) تیرے ہاتھ پاؤں تو بالکل صحیح سلامت ہیں تم خود کیوں اپنی روزی حاصل کرنے کے لئے کوشش نہیں کرتے؟ جس بے کاری کی حالت میں تم بیٹھے ہو تو مر جاؤ گے مگر روزی سے محروم رہو گے۔

اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان مجبور محض نہیں ہے بلکہ مکمل طور پر اختیار کا مالک ہے۔ منشائے ایزدی بھی یہی ہے کہ وہ (انسان) اٹھے اور اٹھ کر اپنی روزی کے لئے ہاتھ پاؤں ہلائے اور اسی کو توکل کا نام دیا گیا ہے۔

اور سنیے ایک اعرابی رسول کریم ﷺ کی ملاقات کے لئے حاضر ہوا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا کہ پیدل آئے ہو یا سواری پر؟ اعرابی نے جواب دیا کہ حضور ﷺ اونٹ پر سوار ہو کر حاضر ہوا ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے دوبارہ پوچھا کہ اونٹ کہاں ہے۔ عرض کیا کہ حضور ﷺ باہر خدا کے توکل پر چھوڑ آیا ہوں۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا جاؤ اور خدا کے توکل پر ہی اونٹ کے گھٹنے باندھ لو۔ حضرت مولانائے روم قدس سرہ اس قصہ کو بیان فرمانے کے بعد ہدایت کے طور پر لکھتے ہیں

گفت پیغمبر بہ آواز بلند ۔۔۔ بر توکل زانوئے اشتر بہ بند

داؤد: اسلم بھائی! آپ اصل موضوع سے ذرا ہٹ گئے ہیں۔

اکرم: مگر میرے خیال میں ایسے واقعہ کا موضوع کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے اس لئے کہ اس سے انسان کے اختیار کا پورا پورا تاثر پیدا ہوتا ہے۔

داؤد: اور میرے خیال میں اسلم بھائی نے کلی طور پر جبر کا ثبوت پیش کیا ہے۔ لنگڑی لومڑی کی مثال سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اسے ایسا بنا دیا تھا اور صوفی بزرگ کا ارادہ بھی نوشتہ تقدیر کو دیکھنا تھا اور وہ مجبور تھا کہ ایسا کرے۔ اب آپ مجھے اجازت دیں کہ میں بھی آپ کو ایک سچا واقعہ بیان کروں۔

اشرف: بڑی اچھی بات ہوگی۔

تمام شرکائے محفل: بالکل! بیان کریں۔ تو فرمایئے!

داؤد: (تھوڑی دیر کے لئے چپ رہا جیسے اپنے ذہن میں اس واقعہ کو پوری طرح لانا چاہتا ہو پھر گلے کو تازہ کرتے ہوئے کہا:

ایک شہر میں کوئی سوداگر رہتا تھا۔ مال و دولت بے حساب رکھتا تھا وہ ایک پیر کا مرید تھا۔ مرتے وقت اس نے اپنے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو وصیت کی کہ پیر صاحب سے مکمل عقیدت استوار رکھیں اور پیش آنے والی مشکلات کے بارے میں پیر صاحب کی ہدایات پر عمل کریں۔ مگر اس کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے عیش و عشرت میں کھو گئے، ساری دولت اڑا دی اور قلاش ہو گئے۔ مجبور ہو کر ان کی بہن بازار حسن میں بیٹھ گئی اور عصمت فروشی شروع کی مگر پھر بھی افلاس اور غربت سے پیچھا نہ چھڑا سکی۔ ادھر جب پیر صاحب کو یہ سب کچھ معلوم ہوا تو سب سے پہلے وہ لڑکی کے پاس گیا۔ لوگوں نے جب پیر صاحب کو بازار حسن میں دیکھا۔ حیران ہو گئے۔ مگر بولا کوئی بھی نہیں۔ جب لڑکی نے پیر صاحب کو دیکھا اس

کے قدموں میں گر گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ پیر صاحب نے اس کے سر پر دست شفقت رکھ کر فرمایا کہ بہتر تو یہ ہوتا کہ اپنے والد کی وصیت کے مطابق تم سب میرے پاس آتے مگر آپ لوگ ایسا نہ کر سکے چنانچہ میں اپنا اولین فرض جان کر آپ کے پاس آیا ہوں میں تم کو کچھ رقم دیتا ہوں اور تم کو اس سے اپنے لئے ایک بالا خانہ خریدنا ہوگا۔ نیز ایک خدمت گار عورت بھی رکھ لو اور اس کے علاوہ جو شخص بھی تیرے وصال کے لئے آتا ہو تو اس کے عوض پورے ایک سو روپے لینا اور اس سے کم قبول نہ کرنا۔

ڈاکٹر مکرم: تعجب ہے بجائے اس کے پیر جی لڑکی کو اس بازار سے باہر کھینچ لاتے مگر یہاں تو انہوں نے اس کو مستقل طور پر اس بازار کی زینت بنا دی۔

داؤد: ڈاکٹر صاحب آپ کے اعتراض میں اس لئے کوئی وزن نہیں کہ آپ تو مذہب کے مخالف ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ پیر صاحب کشف و کرامت تھے۔ کشف ہی کے ذریعے ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ لڑکی کی قسمت ہی میں ''بالا خانہ'' لکھا ہے اور یہی ہو کر رہے گا۔ خیر تو لڑکی اپنے ذاتی بالا خانے کی مالک بن گئی اپنے لئے ایک خادمہ کا بندوبست بھی کیا اور تھوڑا عرصہ نہ گزرا تھا کہ بے حد دولت مند ہو گئی۔ ابتدائی دنوں میں تو کوئی بھی ایک سو روپیہ دینے پر راضی نہ ہوتا تھا مگر آخر کار یہی قیمت چل نکلی، لوگ آنا شروع ہو گئے اور وہ بہت مشہور ہو گئی۔ بعد ازاں پیر صاحب سوداگر کے بڑے بیٹے کے پاس چلے گئے۔ وہ بھی بڑا خوش ہوا۔ پیر صاحب اس کو اپنے ہمراہ بازار لے گئے اور ایک جال خرید کر اس کو دے دیا اور اس ہدایت کے ساتھ کچھ رقم بھی دے دی کہ جنگل جا کر جال پھیلاتا رہے اور خدا کے حکم سے اسی جال میں صرف باز ہی پکڑا جائے گا مگر بازار میں اس باز کو

پورے ایک سو روپیہ سے کم فروخت نہ کرے۔ سواگلے روز سوداگر کا بیٹا جنگل کی طرف چلا گیا۔ جال پھیلا کر باز کے گرفتار ہونے کے انتظار میں ایک طرف چھپ کر بیٹھ گیا۔ دو گھنٹے نہ گزرے ہوں گے شہباز جال میں گرفتار ہو گیا۔ سوداگر کا بیٹا بے حد خوش ہو گیا اور شہباز کو بازار میں پورے ایک سو روپے کے عوض فروخت کر دیا۔

اشرف: شاید اس زمانے میں باز کی قیمت سو روپے اور مرغ کی قیمت فقط دو پیسے ہوگی؟ جیسے رحمان باباؒ نے فرمایا ہے

باز پہ سل روپۓ مردار

چرگ پہ دوہ پیسے حلال

(سو روپے کے عوض خریدا ہوا باز مردار ہوتا ہے مگر دو پیسے کے عوض خریدا ہوا مرغا حلال ہوتا ہے)

داؤد: اس کے بعد پیر صاحب سوداگر کے دوسرے فرزند کے ہاں چلے گئے۔ کچھ رقم بھی اس کو دے دی اور یہ ہدایات بھی فرمادی کہ منڈی جا کر گھوڑا خریدے مگر اس کے گھوڑے کو پورے ایک سو روپے سے کم فروخت نہ کرے۔ سوداگر کے بیٹے نے اس پر عمل کیا اور تھوڑے سے عرصہ میں اس کا بھی کام بن گیا۔ مقصد یہ کہ پیر صاحب ان کی تقادیر کو تو یکسر بدلا نہیں سکتے تھے لیکن ان کی تقادیر کے جریان کے سلسلے میں ایسی صورتیں اختیار کیں کہ تینوں مطمئن ہو گئے۔

(اسی اثناء میں اشرف خان کا ایک نوکر اف اف کرتا ہوا آ گیا۔ اشرف خان نے اس سے سبب پوچھا کہ بھئی! کیا بات ہے؟ تو نوکر نے جواب دیا کہ مجھے بچھو نے ڈنک مارا ہے۔ درد بہت محسوس کرتا ہوں۔ اس لئے مولوی صاحب کے پاس آیا

ہوں کہ مجھے دم کرے)

مولوی احمد: تو بہتر یہ ہوگا کہ یہ کام صوفی صاحب کر دیں اس لئے دم اور دعا دونوں ہی کسی زاہد اور عابد کی طرف سے موثر ہوتے ہیں۔ ہم ملا صاحبان تو بس علم حاصل کرتے ہیں اور ہم میں سے بہت کم لوگ (صحیح معنوں میں) عابد و زاہد ہوتے ہیں چنانچہ ہماری دعا یا دم موثر نہیں ہوتے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے هیں ومن طلب الدعا بغیر زهد . کما فی اللیل یرمی بالذباب

ڈاکٹر مکرم: اس کا مفہوم کیا ہے؟

مولوی احمد: فرماتے ہیں ''جو کوئی زہد کے بغیر دعا مانگتا ہے تو یہ بالکل ایسا ہے جیسے گھپ اندھیرے میں کسی مکھی پر تیر چلا رہا ہو۔''

اکرم: سبحان اللہ! اس شعر میں کتنا خوبصورت نقشہ کھینچ کر پیش فرمایا ہے۔

ڈاکٹر مکرم: واقعی بہترین شعر ہے۔

مولوی احمد: اچھا تو میاں! صوفی صاحب کے پاس جاؤ کہ دم کرے۔

اکبر: میں اپنے تئیں اس قابل نہیں پاتا۔

مولوی احمد: بسم اللہ کیجئے۔

(صوفی اکبر اس ملازم کو دم کرتا ہے۔ ملازم کے چہرے سے راحت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور کہتا ہے کہ ''صوفی صاحب! خدا آپ کو بخش دے اور آپ کے درجات کو بلند فرمائے۔)

اشرف: کیوں میاں! درد جاتا رہا؟

نوکر: بالکل! میں اچھا ہو گیا۔

ڈاکٹر مکرم: (ہنستے ہوئے) دراصل یہ ایک نفسیاتی ٹوٹکا تھا۔ نفسیاتی طور پر اس نوکر کا یہ عقیدہ

تھا کہ گویا دم اس پر اثر کر رہا ہے اور بس اسی وجہ سے اس کو تسلی حاصل ہوئی اور تسلی کے حصول کے ساتھ ساتھ اس کے پختہ یقین کی وجہ سے اس کے دماغ سے درد کا احساس ختم ہوگیا۔اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔

مولوی احمد: خوب! تو ڈاکٹر صاحب! ذرا یہ تو بتا دیں کہ جب اس شخص کو بخار ہو جاتا ہے تو دوائی کیوں استعمال کرتا ہے؟ (صرف اس لئے کہ یہی دوائی) یقین ہی پیدا کر دیتی ہے کہ بخار ختم ہوگیا۔(یعنی دوائی اور دم کرنے میں یہی قدر مشترک ہے)

ڈاکٹر مکرم: ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا (کیونکہ) یقین کو پیدا کرنے کے لئے ایسے اسباب یا ذریعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔جس طرح اس نوکر کے لئے صوفی کے دم کرنے کا ذریعہ ثابت ہوا۔بس اس کے اپنے یقین ہی کی وجہ سے درد رفع ہوگیا۔(بہ الفاظ دیگر) الفاظ میں کوئی اثر نہ تھا۔

مولوی احمد: ہو بہو ایسی بات حکیم بوعلی سیناؒ نے بھی اس وقت کے مشہور صوفی بزرگ حضرت ابو سعید ابوالخیر قدس سرہ سے کی تھی۔

ڈاکٹر مکرم: وہ کیا واقعہ تھا؟

مولوی احمد: ان دونوں کے درمیان بھی کچھ ایسی ہی بحث چل رہی تھی کہ دم کرنے میں اثر ہوتا ہے کہ نہیں ہوتا؟ تو بوعلی سینا کا عندیہ یہ تھا کہ اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ (ایک شخص) چند الفاظ بول کر کسی مریض کی طرف پھونک دے اور وہ مریض صحت یاب ہو جائے۔حضرت ابوسعید ابوالخیر قدس سرہ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ حکیم صاحب! میں تو آپ کو ایک انتہائی فاضل آدمی سمجھ رہا تھا مگر معلوم ہوا کہ آپ پرلے درجے کے جاہل ہیں۔یہ سن کر بوعلی سینا کو غصہ آیا اور کہا کہ ابوسعید

جہالت کا مظاہرہ تو خود آپ نے کیا جواباً حضرت ابوسعید ابوالخیر قدس سرہ نے فرمایا کہ حکیم صاحب! آپ تو فرما رہے تھے کہ لفظوں میں کوئی اثر نہیں ہوتا مگر کیا آپ نے میرے چند لفظوں کو سن کر غصے کا اظہار نہ کیا؟ چنانچہ حکیم بو علی سینا سمجھ گئے اور مسکرانے لگے۔

اشرف: ڈاکٹر مکرم خان نے نفسیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے اس وجہ سے انہوں نے اس واقعے کی تشریح نفسیات کی روشنی میں کر دی۔

اکرم: علوم نفسیات کی ابتداء اگرچہ فرائیڈ نے کی ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ انسانی نفسیات کا علم ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں ہے۔

ڈاکٹر مکرم: یہ اندازہ آپ نے کیسے لگایا؟

اکرم: ایسے کہ خود فرائیڈ کے شاگردوں نے بھی اس سے اختلاف کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ابھی انسان کائنات کے گورکھ دھندوں میں مشغول ہے اور اپنی ذات کی فکر نہیں کرتا۔

مولوی احمد: شاید اپنے موضوع بحث سے ہم دور ہٹ گئے ہیں۔

اکبر: پھر بھی اس مسئلے یعنی علم نفسیات کا کچھ نہ کچھ تعلق جبر و اختیار سے بھی ہے اور میں صرف اسی قدر عرض کروں گا کہ جس انداز میں اور جس قدر نفسیات کا علم ایک صوفی کو حاصل ہوتا ہے کسی اور کو حاصل نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر مکرم: مگر یہ آپ کس دلیل کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں؟

اکبر: (اس بنیاد پر کہ) عام تعلیم یافتہ انسانوں کے علم کا مدار ان کتابوں پر ہوتا ہے جن کو وہ پڑھ لیتا ہے لیکن ایک صوفی کے نفسیات کے علم کا تعلق عملی اور مشاہدات سے وابستہ ہوتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ ایک صوفی ہمیشہ کے لئے اپنے نفس کے

تحریکات کے مطالعے میں مصروف ہوتا ہے وہ اپنے نفس کی خواہشات کے بالکل برخلاف عمل کرتا ہے اور اسی اثناء میں اسے اکثر نفس کے حیلوں اور تدابیر کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر مکرم: صوفی صاحب! اب معلوم ہوگیا کہ آپ کو اپنے نفس کے حیلوں اور تدابیر کے متعلق کچھ نہ کچھ علم حاصل ہوا ہوگا۔

اکبر: معمولی حد تک۔ زیادہ نہیں۔

اکرم: کسر نفسی چھوڑیے' ڈاکٹر صاحب کے ساتھ نفسیات کے بارے میں بات چیت کیجئے۔

اکبر: مگر میرے خیال میں' سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم داؤد خان اور اسلم کو موقع فراہم کریں کہ وہ جبر و اختیار کے سلسلے میں اپنی بحث انجام تک پہنچا دیں۔

داؤد: جہاں تک میں سمجھتا ہوں اور جس قدر بحث و تمحیص ہماری گفتگو میں ہو چکی ہے وہ کافی ہے لہذا بہتر یہ ہوگا کہ اب دیگر احباب کو بھی کہنے کا موقع فراہم کیا جائے۔

اسلم: (فی الحقیقت) انسان کو مختاری کا عقیدہ رکھنا بنی انسان کے مستقبل کے لئے بھی از حد ضروری ہے۔ اس بناء پر کہ اگر ہم محض جبر کے قائل ہو گئے تو مستقبل کے لئے کوئی پروگرام۔ کوئی منصوبہ نہیں بنا سکتے۔ بلکہ ظاہر ہے کہ ہم (اس صورت میں) آزادی سے فکر کرنے کے قابل بھی نہ ہوں گے'۔

داؤد: وہ کس طرح؟

اسلم: ایسے کہ اگر ہم کسی مسئلے کے حل و عقد کے لئے فکر اور تدبیر کا عمل شروع کر دیں اور اگر یہ فکر اور تدبیر جبر ہی کی پیداوار ہو تو ہم کبھی بھی صحیح حل اور صحیح منزل تک رسائی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جس وقت ہم کسی پیش آمدہ مسئلہ کو حل

کرنے کے لئے جو بھی تدابیر و اسباب ذہن میں لائیں گے تو تھوڑی دیر کے بعد وہی اسباب و تدابیر ہمیں ناکافی دکھائیں دیں گے۔ نتیجتاً ہم مزید اسباب کو تلاش کرنا شروع کر دیں گے۔ اور یہ موخر تدابیر و اسباب پہلے تلاش کردہ تدابیر و اسباب کی جگہ متعین ہوں گے۔ اب اگر نظریہ جبر کو صحیح مان لیا جائے تو ہم نے کسی طور پر بھی اگلے اسباب و تدابیر کی نفی نہ کی ہوگی بلکہ انہی اسباب کو درست اور صحیح مان لیا ہوگا لہذا اس امر سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان مکمل طور پر اختیار کا مالک اور مختار ہے۔

داؤد: (ہنس کر کہتا ہے) مگر (میرے خیال میں) تو اس سے بھی جبر ہی کا ثبوت ملتا ہے اگلے اسباب و تدابیر کو نفی کر کے تو آپ نے جبر کو تسلیم کر لیا اس لئے کہ جبر ہی کے قانون نے صحیح راستے پر چلنے یا بہ الفاظ دیگر قانون جبر کو اپنی منشاء کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت نے آپ کو مجبور کر دیا کہ مزید اسباب و تدابیر پیدا کریں۔

اسلم: میں احباب کی خدمت میں عرض کروں گا کہ وہ داؤد خان کے اس عجیب و غریب منطق پر غور فرمائیں کہ وہ بہ یک وقت جبر کا بھی قائل ہے اور اختیار کا بھی۔ مثلاً مولانائے روم قدس سرہ کا یہ قول کہ ایک فالج زدہ آدمی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں رعشہ ہے لیکن اس مریض کو کوئی اختیار حاصل نہیں کہ ہاتھ کے رعشہ کو قابو میں لے آئے۔ جیسے ایک صحت مند آدمی اپنے ارادہ سے ہاتھ ہلاتا ہے اور جب چاہتا ہے تو ہاتھ ہلانا بند کر دیتا ہے۔

اشرف: یہ اچھی دلیل ہے۔

داؤد: مولانائے روم صوفی ہیں۔ ہمارے اکبر بھی صوفی ہیں۔ وہ اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں کہ اس سلسلے میں صوفیاء کیا فرماتے ہیں؟

اکبر: صوفیاء میں بھی اختلاف موجود ہے۔ان میں جبر کے قائل صوفیاء بھی ہیں مگر ان کے جبر کا عقیدہ ادب اور احترام کا رنگ رکھتا ہے۔

داؤد: مثلاً:

اکبر: مثلاً خواجہ حافظ شیرازی قدس سرہ جبریہ عقیدہ رکھتے ہیں لیکن یہ جبر ادب واحترام کا ترجمان ہے۔

اسلم: وہ کیسے؟

اکبر: یوں کہ حضرت حافظ شیراز قدس سرہ کا ایک شعر ہے!

گناہ گرچہ نہ بود اختیار ما حافظؔ

تو در طریق ادب کوش و گو گناہ من ست

یعنی اے حافظ گناہ کرنا میرے اختیار میں تو نہ تھا مگر ادب کے دامن کو نہ چھوڑنا اور یہی کہنا کہ میں نے خود گناہ کرلیا ہے۔(یعنی یہ نہ کہنا کہ خدا نے مجھ سے کروایا ہے نعوذ باللہ)

احمد: اور اسی خواجہ حافظ کے بارے میں ایک اور قصہ بھی بہت مشہور ہے۔خدا بہتر جانتا ہے کہ اس قصہ کی تاریخی حقیقت کیا ہے تاہم مشہور بہت ہے۔

اکبر: ہاں!میں نے بھی وہ قصہ سنا ہے۔

احمد: یہ قصہ ایک صوفی سے متعلق ہے آپ بھی صوفی ہیں۔چنانچہ آپ ہی اسے بیان فرمادیں۔

اکبر: خوب!تو بات یہ تھی کہ ایران کے ایک بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ پوری سختی کے ساتھ احکام شریعت کی پابندی کی جائے۔طوائفوں سے کہا گیا کہ وہ ساز وآواز کے غیر شرعی پیشہ کو ترک کردیں اور اگر وہ ایسا نہیں کرسکتیں تو مملکت ایران سے جلا

وطن کردی جائیں گی۔ چنانچہ اس پیشہ سے تعلق رکھنے والے خاصے پریشان اور مضطرب ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ طوائفوں میں ''شاخ نبات نامی'' ایک طوائف تھی اور وہ حضرت خواجہ حافظ شیرازیؒ کی بے انتہاء معتقد تھی۔ لہذا اسی طوائف نے دوسری ہم پیشہ طوائفوں کو تسلی دی کہ میں خواجہ حافظ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتی ہوں اور تم سب کی طرف سے عرض داشت پیش کردوں گی کہ شہنشاہ کو یہ حکم واپس لینے کا کوئی مداوہ ہو سکتا ہے؟ بہرحال وہ خواجہ حافظ کے پاس چلی گئی اور شہنشاہ ایران کے حکم کی اطلاع دے دی خواجہ صاحب نے بات سنی تو تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہے۔ بعدازاں اپنے بیاض کو کھول اپنی ایک غزل طوائف کے حوالے کی اور فرمایا کہ جا کر بادشاہ کو سنا دینا۔

احمد: مگر بادشاہ تو اس بات کا مخالف تھا۔ اجازت کیسے دیتا؟

اکبر: جو کچھ بھی تھا اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قصہ صحیح ہے یا غلط۔ بس ایک روایت ہے کہ طوائفوں نے بادشاہ کی خدمت میں درخواست پیش کردی کہ ہم بادشاہ کے حکم کو سر آنکھوں پر مانتے ہیں، نیز ہم نے اس پیشہ سے توبہ کر لی۔ بصورت دیگر ہم اس ملک سے نکل جائیں گے۔ مگر ہم خدمت شاہی میں التجا کرتے ہیں کہ ہمیں ایک موقع فراہم کیا جائے کہ بادشاہ کے حضور میں ایک آخری محفل سجالیں۔ بادشاہ تو ماننے کے لئے تیار نہ تھے مگر اجازت مرحمت فرما دی۔ شاخ نبات نے دربار میں حضرت خواجہ حافظ شیرازؒ کی غزل شروع کی اور جب اس شعر تک پہنچ گئی

در کوئے نیک نامی ما را خبر نہ دارند
گر تو نمی پسندی تغیر کن قضا را

یعنی حق تعالیٰ نے تو خود ہی ہمیں نیکی کے کوچہ میں سے گزرنے کا موقع فراہم نہیں فرمایا۔ اب اگر آپ (بادشاہ) کو ہمارا پیشہ پسند نہ ہو تو اگر تمہارا بس چلے تو ہماری تقدیر بدل ڈالو) کہتے ہیں کہ بادشاہ نے متاثر ہو کر اپنا سابقہ حکم واپس لے لیا۔

داؤد: سمجھدار بادشاہ تھا۔

اشرف: میرے خیال میں آج اتنا ہی کافی ہے۔ ما بقایا بات چیت کل کریں گے۔

سب: مناسب ہے۔

(اور سب کے سب احباب اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے)

# تیسری مجلس

(سردیوں کی آمد آمد تھی۔اشرف خان نے اپنے حجرے میں احباب کی نشست کا انتظام کیا تھا۔سب سے پہلے مولوی احمد تشریف لائے اور عشاء کی اذان دی۔ دیگر احباب نے وضو بنا کر عشاء کی نماز انہی کی اقتدا میں ادا کی۔نماز کے بعد سب حجرے میں جمع ہوئے۔اشرف نے گھر سے چائے منگوائی اور چائے نوشی کے دوران گفتگو کا آغاز ہوا)

اشرف: ہماری گزشتہ دو مجلسوں میں جبر واختیار کے مسئلہ کی معمولی سی وضاحت ہوئی ہے۔ جبری اور قدری نے اس مسئلہ پر (مقدور بھر) بحث کی اب ضروری ہے کہ اس مسئلے پر ایک اور سمت سے بحث کا آغاز ہو۔

اکرم: تو بہتر یہ ہوگا کہ آج مولوی احمد صاحب بحث کا آغاز فرمائیں۔

ڈاکٹر مکرم خان: اور میں نے قرآن مجید کی جو جو آیتیں پیش کی تھیں کہ ان میں تضاد بتائیں تو مولوی صاحب نے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ ان آیات کے تطابق کے سلسلے میں وضاحت فرمائیں گے تو میں امید رکھتا ہوں کہ سب سے پہلے وہ اس سلسلے میں معلومات فراہم کریں گے۔

مولوی احمد: بسم اللہ الرحمان الرحیم ط میں اپنے دوستوں کا ممنون ہوں جو میرے متعلق اس قدر حسن ظن رکھتے ہیں اگر چہ میں بے علم ہوں لیکن احباب نے مجھے علماء کے طبقہ میں شمار کر لیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ذاتی طور پر اپنے اندر ایک بہت بڑی علمی کمزوری محسوس کرتا ہوں لیکن ..........

اشرف: کسرِ نفسی کی کوئی ضرورت نہیں۔

مولوی احمد: بخدا یہ کسرِ نفسی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے ورنہ کون ہے جو صحیح معنوں میں عالم ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ جبکہ آنحضرت ﷺ خود یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ رب زدنی علما یعنی اے خدا میرے علم میں اضافہ فرما۔

اشرف: لیکن پھر آنحضرت ﷺ کی اس حدیث مبارک کا کیا مطلب کہ انا مدینته العلم و علی بابھا (یعنی میں علم کا شہر اور علی کرم اللہ وجہہ اس کا دروازہ ہیں)

اسلم: (ہنستے ہوئے) مجھے ایک عجیب اور نادر بات یاد آ گئی۔

اشرف: کون سی بات؟

اسلم: وہ بھی اسی حدیث مبارک سے متعلق ہے۔

اشرف: تو فرمائیے!

اسلم: میں نے ایک ملا صاحب کے پاس ایک کتاب دیکھی تھی۔ تھوڑی سی میں نے پڑھی بھی تھی۔ اس وقت کتاب کا نام یاد نہیں آ رہا۔ تاہم اسی کتاب کے حوالے سے ملا صاحب نے حدیث مبارک کچھ اس طرح بیان کی تھی انا مدینة العلم و علی بابھا و معاویة قفلھا یعنی میں علم کا شہر ہوں۔ علی اس کا دروازہ ہیں اور معاویہ اس کے قفل ہیں۔

(یہ سن کر سارے احباب ہنسنے لگے)

اشرف: اس کتاب کے ملا صاحب نے یہ حدیث پوری کی پوری تحریر نہیں کی۔

اسلم: آپ کا مطلب کیا ہے؟

اشرف: پوری حدیث کے الفاظ کچھ اس طرح بیان کرنے تھے انا مدینة العلم و علی بابھا و معاویة قفلھا و یزید مفتاحُھا

(باردگر سارے احباب ہنسنے لگے)

مولوی احمد: لاحول ولاقوة الا بالله ۔ہم طبقہ علماء کو اسی قسم کے نام نہاد ملاؤں نے بدنام کیا ہے۔ یہ حدیث بس اسی قدر ہے کہ انا مدينة العلم و علی بابها

اشرف: حیرت ہے کہ پھر ہمارے (بعض) ملا صاحبان ایسے فاسق اور برائے نام مسلمانوں کی حمایت کیوں کرتے ہیں؟

ڈاکٹر مکرم: میرا خیال ہے کہ اب مولوی احمد صاحب کو موقعہ دینا چاہئے کہ وہ جبر و اختیار کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔

سب دوست: ہاں! آج مولوی صاحب کی باری ہے۔

مولوی احمد: درحقیقت یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تین چار سو سال قبل یونان میں اس مسئلے پر بحث اور مناظرے ہوتے رہے ہیں۔فلسفہ کے دو مشہور مکاتیب ابی قوایہ اور رواقیہ ایک دوسرے کے برخلاف نبرد آزما رہے ہیں ابی قوایہ فرقے کا یہ دعویٰ تھا کہ انسان قادر ہے اور اپنی مرضی میں مختار ہے لیکن رواقیہ اس عقیدے کے برخلاف تھے کیونکہ وہ انسان کو مجبور محض مانتے تھے۔

اسلم: اور شاہد آج میں اور داؤد خان ابی قوایہ اور رواقیہ کی ترجمانی کررہے ہیں۔

داؤد: ہر ایک کا اپنا اپنا خیال ہوتا ہے۔

مولوی احمد: یہی وجہ ہے کہ ایک روز مسجد نبویؐ میں اصحاب رسولؐ کے دو گروہوں کے مابین یہ مسئلہ زیر بحث تھا تو آنحضرت ﷺ نے اسے پسند نہ فرمایا۔ آپؐ کے ابرو مبارک پر ناراضگی کے آثار نمودار ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ بے شمار اقوام اسی مسئلہ کے سلسلے میں ہلاک ہوئی ہیں لہذا اس مسئلے کے بارے میں بحث کرنے سے جان بچاؤ اور بس حق تعالیٰ کی تقدیر پر ایمان رکھو۔ بحث مت کرو۔

اکرم: لیکن آنحضرت ﷺ کے بعد بھی علماء کرام نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے گویا انہوں نے حضور اقدس ﷺ کے فرمان کی نافرمانی کی ہے اور ہم بھی اسی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

مولوی احمد: بات یہ نہیں۔ حقیقت کچھ اور ہے جب اسلام کا ابتدائی دور تھا تو اس دور میں جو لوگ ایمان لائے تھے ان میں سے اکثر کو (ابھی) مکمل معرفت حاصل نہ تھی۔ اور اس قسم کی بحث ان کو دوبارہ گمراہی کی طرف دھکیل سکتی تھی۔ بدیں وجہ وہ منع کئے گئے لیکن بعد میں جب لوگ اسلام کے اصولوں کو صحیح طور پر سمجھنے لگ گئے تو اس مسئلے پر بھی تبادلہ خیالات کرنے لگے۔ یہاں تک اس عنوان پر متعدد کتابیں تحریر کیں۔

اکرم: تو اب ان آیتوں کے بارے میں بھی کچھ فرما دیجئے جن کو ڈاکٹر مکرم خان نے متضاد سمجھ لیا ہے۔ مگر آپ نے اس کی تشریح کا وعدہ فرمایا ہے۔

مولوی احمد: بڑی اچھی بات ہے تو میں یہ عرض کروں گا کہ مشیت کے دو اقسام ہیں ایک کو مشیت تکوینی اور دوسری کو مشیت شرعی کہنا مناسب ہوگا۔ اب جہاں تک مشیت تکوینی کا تعلق ہے تو یہ جبر پر قائم ہے آپ کائنات کے طبعی نظام پر غور فرمائیں۔ فضا میں بے شمار اجرام اپنے اپنے راستوں پر رواں دواں ہیں گرمی کی وجہ سے پانی سے بخارات بن کر فضا میں سعود کرتے ہیں ان سے بادل بنتے ہیں بادلوں کو جب ایک خاص انداز ے سے ٹھنڈک پہنچتی ہے تو بارش شروع ہو جاتی ہے۔ پانی کی یہ طبعیت ہے کہ ہمیشہ نیچے کی طرف بہتا ہے۔ حیوانات اپنی مخصوص تخلیقی فعالیت کے مطابق کام کرتے ہیں۔ چیرنے پھاڑنے والے جیسے شیر، چیتا، خوک اور ایسے ہی دیگر درندے گوشت کھاتے ہیں۔ گھاس نہیں کھا سکتے۔ دوسرے

حیوانات مثلاً ہاتھی، گائے، بھینس اور بکری وغیرہ گوشت نہیں کھا سکتے۔ وہ گھاس کھاتے ہیں۔ انسان بھی ایک حیوان ہے اور جب اسے نیند آتی ہے تو مجبوراً سو جاتا ہے۔ اسی انسان کو پیاس بھی لگتی ہے اور بھوک بھی۔ گویا انسان کو بھی دو قوتیں دی گئی ہیں۔ جن میں سے ایک کو قوت شہوانیہ اور دوسری کو قوت غضبیہ کہتے ہیں اور انسان مجبوراً ان دونوں قوتوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔

اسلم: لیکن (کیا) ان فطری صفات کو قابو میں رکھنے پر بھی قادر ہے؟

مولوی احمد: ہے۔ مگر بہت ہی تھوڑے سے وقفے کے لئے۔ مثال کے طور پر ہم مسلمان لوگ سارا دن روزہ رکھتے ہیں۔ گویا اپنی جبلی اوصاف، بھوک و پیاس کا مقابلہ (مخالفت) کرتے ہیں لیکن ہمیشہ کے لئے ایسا نہیں کر سکتے اور یہی انسان کی وہ لاثانی صفت ہے جس کے طفیل وہ فطرت کو ضابطہ (قابو) میں لا سکتا ہے۔ اس حقیقت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وجود انسانی میں ایک ایسا جوہر موجود ہے جو مادی نہیں اور یہی جوہر انسان کی خود ارادیت اور مختار ہونے کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔

اسلم: گویا انسان مختار ہے۔

مولوی احمد: (اور سنیئے) ایک روز کسی شخص نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے دریافت کیا یا علی! انسان مجبور ہے یا مختار؟ تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ تم اپنی ایک ٹانگ اوپر اٹھالو۔ اس نے ایک ٹانگ اٹھالی اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا چلو اب اپنی دوسری ٹانگ بھی اوپر اٹھالو۔ اس شخص نے عرض کیا کہ یا علی کرم اللہ وجہہ یہ میرے لئے ممکن نہیں۔ تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ بس سمجھ لو کہ انسان نہ تو مکمل طور پر مجبور ہے اور نہ ہی مختار۔ اور یہ میری اس بات کی

دلیل ہے کہ مشیت دو اقسام پر مشتمل ہیں یعنی مشیت تکوینی اور مشیت شرعی پر۔ حق تعالیٰ نے جو جو شرعی احکام بھیجے ہیں ان میں امر و نہی دونوں شامل ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر انسان ایسا کرنے پر قادر نہ ہوتا تو شریعت کی پابندی نہ کرپایا۔ (ایسا ہے کہ) جن امور میں یا تکوینی امور میں انسان مجبور ہے تو ان امور میں اگر اس سے نافرمانی بھی صادر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سزا نہیں دیتا۔مثال کے طور پر اگر مجبوری سے (اضطراری حالت میں) مردار کھالے یا علاج کے لئے شراب کا استعمال کرے تو حق تعالیٰ سزا نہیں دیتا۔

اشرف: مولوی صاحب! ان آیتوں کی تشریح دوبارہ یاد دلاتا ہوں۔

مولوی احمد: میں اسی طرف آرہا ہوں اور سب سے پہلے اس آیت کی تلاوت کا شرف حاصل کروں گا ارشاد خداوندی ہے واللہ خلقکم وما تعملون (سورۃ الصفت آیت ۹۶) یعنی خدا نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور تمہارے اعمال کو بھی پیدا کیا ہے۔ظاہر ہے کہ انسان جو افعال یا اعمال کرتا ہے تو ایسا کرنے کے لئے وہ ذرائع اور اسباب بھی استعمال میں لاتا ہے۔مثلاً ذہن، ہاتھ، پاؤں دولت وغیرہ۔ یہ بھی ثابت ہے کہ یہ تمام اسباب اور ذرائع بھی حق تعالیٰ نے پیدا فرمائے ہیں اور ان کے ذریعے جو افعال صادر ہوتے ہیں ان کی اضافت یا نسبت بھی خدا کی طرف ہوگی ۔اسی طرح ان اسباب و ذرایع کا تعلق مشیت تکوینی سے وابستہ ہے۔تو معلوم یہ ہوا کہ ان اعمال کا خالق تو حق سبحانہ وتعالیٰ ہے لیکن ان اعمال کے کاسب ہم ہیں اور اسی بنیاد پر ہم سزا و جزا کے مورد ہیں۔

اشرف: مشکل مسئلہ ہے......!

مولوی احمد: (دیکھئے) لوہا یا فولاد حق تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے۔ہم اس سے اسلحہ اور اپنے کام

کی دوسری چیزیں بھی تیار کرتے ہیں۔ ہمارا ذہن اسلحہ بنانے کے کام میں مصروف ہوتا ہے۔ اسلحہ بن جاتا ہے اس کے بعد اسلحہ کے استعمال کی باری آتی ہے۔ چنانچہ اسلحہ کے استعمال کا اختیار ہمیں حاصل ہوتا ہے۔ یعنی (بہ جبر) خدائے تعالیٰ ہم سے استعمال نہیں کراتا۔ قتل کا ارتکاب ہم خود کرتے ہیں۔

داؤد: تو کیوں اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی سے، علم نہیں ہوتا کہ زید فلاں دن بکر کو قتل کر دے گا؟

مولوی احمد: اسی گمراہ کن فکر نے تو آپ کو جبری بنا دیا ہے۔ کیونکہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ حق تعالیٰ کو علم ہوتا ہے کہ زید بکر کو قتل کرے گا لیکن اس کے علم کے ساتھ۔ اس کا ارادہ شامل نہیں ہوتا۔ یعنی اگر خدا کا یہ ارادہ ہوتا کہ زید بکر کو قتل کر دے تو اس صورت میں آپ کا خیال درست ہوتا۔ لیکن یہاں تو خدا زید کو سزا دیتا ہے۔ چنانچہ اس سے معلوم ہوا کہ زید کے فعل کے ساتھ حق تعالیٰ کا ارادہ شامل نہ تھا اور اس کا تعلق شریعت کے احکام (معشیت) سے ہے۔

ڈاکٹر مکرم خان: اب وہ آیت جس کا مفہوم یہ تھا کہ تم پر جو مصیبت نازل ہوتی ہے خدا کے حکم سے نازل ہوتی ہے۔

مولوی احمد: تو صحیح بات یہ ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ زید کے پیٹ میں درد ہے تو یہ خدا کے ارادہ سے پیدا ہوا ہے یا بذات خود زید کی بد پرہیزی کی وجہ سے؟ اس لئے کہ خدا تو یہ بھی فرماتا ہے کہ تم پر کوئی مصیبت نہیں آتی جب تک تم خود اپنے ہاتھوں سے اسے نہ بنا ڈالو۔

ڈاکٹر مکرم خان: مولوی صاحب! بات پھر بھی ادھوری رہ گئی۔ جو مصیبت زید نے اپنے لئے بذات خود نہ بنائی ہو اور خدا کے ارادے سے نازل ہو جیسے اس آیت شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں کوئی مصیبت نہیں پہنچتی۔ مگر اللہ کے ارادے سے۔ اس

بارے میں آپ کیا فرمائیں گے؟

مولوی احمد: اس کا تعلق بھی مشیت تکوینی سے ہے۔ آپ لوگوں کو یاد ہوگا۔ کہ عرصہ ہوا کوئٹہ میں زلزلہ آیا تھا اور اس میں ہزارہا بندگان خدا اور دوسرے جاندار وغیرہ ہلاک ہو گئے تھے۔

داؤد: یہ بھی خدا کی رضا تھی۔

مولوی احمد: بات یہ ہے کہ زلزلہ تکوینی مشیت کے مطابق آتا ہے اور بالفرض اگر حق تعالیٰ کے ارادے سے آئے تو یہ لوگوں (انسانوں) کو سزا کے طور پر ہوگا جس طرح خدا نے قدیم زمانے میں بہت سی قوموں کو انواع و اقسام کے عذابوں سے فنا کیا ہے۔ وہ لوگ زمین پر فساد پھیلا رہے تھے۔ کبھی یہ حق تعالیٰ کی طرف سے امتحان کے طور پر بھی ہوتا آیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ میں ضرور تم لوگوں کو خوف، فاقہ، مالوں اور جانی نقصان کے ذریعے آزماؤں گا۔

ڈاکٹر مکرم خان: آزمائش اور امتحان تو وہ لے جس کو علم نہ ہو۔ مثلاً اساتذہ اپنے شاگردوں سے امتحان لیتے ہیں۔ تو اس لئے کہ انہیں (بخوبی) معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے شاگرد کس حد تک ترقی کے قابل ہیں؟ مگر خدائے تعالیٰ تو عالم ہے ہر چیز اسے بخوبی معلوم ہے پھر امتحان یا آزمائش کا جواز نہیں رہتا۔

مولوی احمد: ڈاکٹر صاحب! حق تعالیٰ جس نوعیت سے اپنے بندوں کا امتحان لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس علیم و خبیر ذات کو اپنے بندوں کی حالت کا علم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسی امتحان کے بعد خود بندے کو اپنی حقیقی حالت کا علم حاصل ہو جائے۔ کیونکہ وہ اکثر و بیشتر اپنی ذات کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوتا ہے اور یہی سمجھتا ہے کہ میں ہی سب کچھ کر سکتا ہوں یا کرتا

ہوں۔مگر جب امتحانی چکر میں مبتلا ہوجاتا ہے تو اپنی خامیوں اور حیثیت سے خبردار ہوجاتا ہے۔

اشرف: یہ بہترین دلیل ہے۔

ڈاکٹر مکرم خان: ہر صاحب دل اسے پسند کرے گا۔

مولوی احمد: تو وہ سب کی سب قرآنی آیتیں جو انسان کے مجبور ہونے کے سلسلے میں پیش کئے جاتے ہیں۔تکوینی مشیت سے تعلق رکھتی ہیں۔مابقایا وہ آیتیں جو انسان کے مختار محض ہونے کے بارے میں پیش کی جاتی ہیں تو وہ سب شرعی مشیت سے تعلق رکھتی ہیں۔مثلاً یہ آیت مبارک **فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر** یعنی جو چاہے ایمان لائے جو چاہے کفر اختیار کرے۔

داؤد: مگر یہ سب کچھ پہلے سے خدا کے علم میں ہوتا ہے۔جو ایمان لاتے ہیں وہ بھی اور جو نہیں لاتے وہ بھی۔اور جو چیز خدا کے علم میں جس طرح سے بھی ہوگی (لامحالہ) خارج میں بھی ویسی ہی ہوگی۔

ڈاکٹر مکرم: تعجب تو یہ ہے کہ (جب) خالد خدا کے علم میں کافر ہے تو پھر اسے ایمان لانے کی دعوت کا مطلب کیا ہے؟

مولوی احمد: متاسفانہ طور پر عرض ہے۔کہ آپ نے میری باتیں غور سے سماعت نہیں فرمائی ہیں۔ڈاکٹر صاحب! حق تعالیٰ کے علم اور ارادہ میں بہت فرق ہے۔فرمایئے کیا حق تعالیٰ کا علم اکتسابی ہے یا ذاتی؟ ظاہر ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا علم ذاتی ہے اور نیز اس ذات اقدس کا علم عین ذات ہے اس کے علم میں جو جو معلومات ہیں۔وہ ذات کے ساتھ آئی ہیں۔یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ حق تعالیٰ نے اکتسابی طور پر ان کا علم حاصل کیا ہے اس لئے وہ ضرور ایسی ہوں گی جس طور پر وہ ذاتی علم میں

ہیں اوران اعمال کا مظاہرہ کریں گی جو اس کے وجود کی اقتضا ہوگی مگر حق تعالیٰ کا ارادہ ضروری نہیں، کہ وہ اس کے (علم) ساتھ شامل ہو۔

ڈاکٹر مکرم: میری قوت فکر ختم ہوگئی ہے؟ (حیرت ہے) پھر ایمان لانے کی دعوت کیوں دی جاتی ہے؟

صوفی اکبر: دعوت، محض ایک فرد کو نہیں دی جاتی بلکہ تمام بنی نوع انسان کو دی جاتی ہے اور جب میری باری آئے گی تو اس کی مکمل وضاحت کرلوں گا۔ کہ وہ اعیان یا وہ بنی آدم (انسان) جو حق تعالیٰ کے علم میں کافر ہیں وہ بھی کفر سے بچ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر مکرم: خوب! ہم ضرور سنیں گے۔

اکبر: مولوی صاحب! آپ اپنی بات جاری رکھیں۔

مولوی احمد: میرے خیال میں ممکنہ حد تک میں نے اپنی استعداد کے مطابق اس مسئلہ کی وضاحت کی ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ میرے خیالات سے سب متفق ہوں (کیونکہ) اس مسئلہ کے متعلق اختلاف ہوتا آیا ہے۔ تاہم میرے خیال میں انسان نہ تو پورا پورا مختار ہے اور نہ مکمل طور پر مجبور ہے۔

ڈاکٹر مکرم: مولانا صاحب! (بات یہ ہے) کہ انسان یا تو مختار ہوگا اور یا مجبور۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بہ یک وقت مختار بھی ہو اور مجبور بھی؟

اسلم: (ہنستے ہوئے) یہ معاملہ بھی حق تعالیٰ کی صفات کی طرح تعجب انگیز ہے وہ جو کہا گیا ہے کہ صفات الٰہی نہ عین ذات ہیں اور نہ غیر ذات۔ گویا بہ یک وقت عین ذات بھی ہیں اور غیر ذات بھی۔

مولوی احمد: اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر صفات کو عین ذات تسلیم کیا جائے تو تعدد قدما کے قائل ہونے کا احتمال پیدا ہو جائے گا (جو محال ہے) اور نیز ذات میں کثرت بھی پیدا

ہو جائے گی اور اگر صفات کو غیر ذات کہا جائے تو حق تعالیٰ بغیر صفات کے رہ جائے گا۔

اشرف: میرے خیال میں یہ مشکلات اس لئے پیدا ہوئی ہیں کہ حق تعالیٰ کی صفات کو زائد بر ذات کہا گیا ہے گویا ذات واحد میں کثرت ثابت کی گئی ہے۔

اکبر: جبکہ یہ تمام صفات صرف نسبتیں ہیں جو ذات کی طرف راجع ہیں یعنی وہی ذات واحد رحیم بھی ہے۔ رحمان' ستار اور (اسی طرح) جملہ صفات کا حامل بھی ہے اور اگر صفات کو زائد بر ذات مان لیا جائے تو یہی ذات صفات کی معلول ہو جائے گی۔ استغفر اللہ

مولوی احمد: گویا حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خیال کے مقابلے میں حضرت شیخ اکبر محی الدینؒ ابن العربی کا خیال صحیح ہے کہ صفات عین ذات ہیں۔

اکبر: ہاں! میرا بھی یہی خیال ہے۔

مولوی احمد: (دراصل) یہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا مسئلہ ہے جس کا آج تک فیصلہ نہ ہو سکا ہے۔ ہم (ضرور) صوفی صاحب کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈالیں۔

صوفی اکبر: انشاء اللہ! میں اپنی استعداد کے مطابق اس بارے میں اپنے معروضات پیش کروں گا۔

اکرم: مگر جبر و اختیار کے بارے میں مزید کون بولے گا؟

اشرف: ڈاکٹر صاحب کو بھی موقع دینا ضروری ہے۔

ڈاکٹر مکرم: میرے خیال کا تو آپ کو علم ہوگا کہ مذہبی نقطہ نظر سے اس مسئلہ کے متعلق بحث نہیں کر سکتا اس لئے کہ میں تو مروجہ مذاہب جن کو الہامی مذاہب کہا جاتا ہے کسی

ایک کا بھی قائل نہیں نہ ہی الہام کو مانتا ہوں لہٰذا اس مسئلہ کے متعلق مذہبی نقطہ نگاہ سے کیا عرض کرسکوں گا؟ البتہ انسانی نفسیات کی روشنی میں کچھ نہ کچھ کہہ سکوں گا۔ وہ بھی آج اور اسی وقت نہیں۔ بلکہ اس کے لئے مجھے با قاعدہ تیاری اور مطالعہ کرنا پڑے گا۔

اشرف: اچھا تو اب تک اس بحث میں ہمارے دو دوستوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرلیا ہے یعنی داؤد خان اور اسلم نے اپنا اپنا نظریہ ظاہر کیا۔ ان میں داؤد خان نے جبر اور اسلم نے قدر (اختیار) کی ترجمانی کی۔ تیسرے مرحلے میں مولوی احمد نے اہل سنت والجماعت کے نظریہ کی ترجمانی کی۔ ظاہر ہے کہ داؤد خان کے نقطہ نظر سے انسان مجبور محض ہے جبکہ اسلم کا دعویٰ ہے کہ انسان مکمل طور پر مختار ہے لیکن مولوی احمد صاحب کا نقطہ نظر ہمارے دو دوستوں داؤد خان اور اسلم کے نظریہ کے بین بین ہے یعنی یہ کہ انسان نہ تو مکمل طور پر مجبور ہے اور نہ کلی طور پر مختار ہے اور مولوی صاحب نے اس کی وضاحت مشیت تکوینی اور مشیت تشریعی کی روشنی میں بڑے شاندار طریقے پر کردی اور میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب کا وہ اعتراض موزون نہ تھا کہ یہ ممکن نہیں کہ انسان بہ یک وقت مجبور بھی ہو اور مختار بھی۔

بعد ازاں حق تعالیٰ کی صفات کی بحث چھڑ گئی۔ (تاہم) جہاں تک میرا خیال ہے تو یہ کہ تکوینی مشیت کی رو سے انسان مجبور اور تشریعی مشیت کے رو سے مختار دکھائی دیتا ہے۔ انشاء اللہ یہ بحث آئندہ شب کو مزید آگے بڑھائیں گے۔

# چوتھی مجلس

(نماز عشاء ادا کرنے کے بعد احباب اشرف خان کے حجرے میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ باتوں کا آغاز اشرف خان نے کیا)

اشرف: آج ہمارا ایک رشتہ دار حسن خان فوت ہو گیا تھا سارا دن میں ان کے حجرے میں رہا۔

اکبر: ہاں! میں نے بھی فاتحہ کے لئے حاضری دی تھی۔ حسن خان مرحوم کی موت بھی عجیب وغریب تھی۔

داؤد: وہ کیسے؟

اکبر: وہ ایسے کہ آج سے کوئی دس دن قبل مجھے کہا تھا کہ میری موت کا وقت قریب آ گیا ہے۔

داؤد: وہ کس بنیاد پر ایسا کہہ رہا تھا؟ یہ یقین اسے کیسے آ گیا؟

اکبر: دراصل اس نے ایک خواب دیکھا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ کہ میں خواب میں ایک جنگل سے گزر رہا تھا اچانک میری نظر ایک شیر پر پڑی جو ایک درخت کے پاس بیٹھا تھا۔ مرحوم کہہ رہا تھا کہ جب میں نے اس کو دیکھا تو مارے خوف کے میری ٹانگوں سے دم نکل گیا۔ میں وہاں سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا مگر میرے قدم نہ اٹھتے تھے۔ اسی اثناء میں شیر نے بھی دیکھ لیا تو پوری قوت سے مجھ پر حملہ آور ہوا اور اپنے دانت میری گردن میں پیوست کئے۔ میری چیخ نکل گئی اور بیدار ہو گیا؟

ڈاکٹر مکرم: (ہنستے ہوئے) تو گویا آپ کا یہ خیال ہے کہ یہی اس خواب کی تعبیر تھی؟

اسلم: کیوں۔ ڈاکٹر صاحب! آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر مکرم: یہ مسئلہ انسانی نفسیات سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ خواب انسان کے لاشعور کی پیداوار ہوتے ہیں اور جو خیالات کسی انسان کے شعور میں ہوتے ہیں بس وہی خیالات مختلف شکلوں میں خواب میں بھی دیکھے جاتے ہیں یا جس فرد نے اپنے جذبات کو دبا دیا ہو اس کے نتیجے میں وہی فرد مختلف قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے جنسی جذبے کو دبا دے تو یہی دباؤ مختلف قسم کی بیماریوں کا روپ دھار لیتا ہے۔

اشرف: بہ الفاظ دیگر آپ کے خیال میں خواب مستقبل کا آئینہ دار نہیں ہوتا اور یہ کہ گویا خوابیں انسان کے اپنے خیالات ہوتے ہیں۔

مکرم: حقیقت بھی یہی ہے۔

اکبر: ڈاکٹر صاحب نے یہ نظریہ اس لئے قائم کیا ہے کہ وہ مذہب کو نہیں مانتے ورنہ ایک مسلمان جو قرآن مجید پر عقیدہ رکھتا ہے۔ مبشرات کے وجود سے کس طرح انکار کر سکتا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خواب دیکھنا کہ وہ اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو راہ خدا میں قربان فرما رہے ہیں۔ مزید برآں رسول کریم ﷺ کا یہ ارشاد مبارک کہ ''سچے خواب نبوت کا ایک حصہ ہیں'' لہذا ہم خوابوں کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔

مولوی احمد: (آج بھی) ایسے انسان موجود ہیں جن کے خواب بالکل صحیح ثابت ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر مکرم: مگر مولانا! وہ سب اتفاق کی بات ہوتی ہے۔

اکرم: جناب ڈاکٹر صاحب! اتفاق عقلمندوں کے نزدیک کوئی چیز ہی نہیں۔ ہر کام کے لئے علت ہوتی ہے اور بغیر علت کے معلول کا واقعہ ہونا قطعی ناممکن ہے۔

ڈاکٹر مکرم: علت و معلول کا میں بھی قائل ہوں۔ خواب دیکھنا بھی علت کا متقاضی ہے۔ اور

معلول وہ واقعات ہوتے ہیں جو خواب میں دیکھے جاتے ہیں۔

اشرف: جبر واختیار کا مسئلہ ایک بار پھر التوا میں پڑ گیا۔

اکبر: ایک لحاظ سے ان باتوں کا بھی جبر واختیار سے تعلق ہے اور اگر آپ سب دوستوں کی اجازت ہو تو میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اس بارے میں گفتگو کراوں گا۔

احباب: بڑی اچھی بات ہوگی۔ ضرور یہ گفتگو شروع کریں۔

اکبر: میں نفسیات کا طالب علم نہیں البتہ منازل تصوف وسلوک کی برکت سے جن نفسیاتی حقائق کا مجھ پر انکشاف ہوا ہے وہ آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر مکرم: ارشاد!

اکبر: ڈاکٹر صاحب! آپ کے علم میں شعور کے کتنے درجے ہیں؟

ڈاکٹر مکرم: صرف دو یعنی شعور اور لاشعور۔

اکبر: مگر اس کے برعکس میرے نزدیک شعور کے تین درجے ہیں یعنی شعور یا فوق الشعور، تحت الشعور اور تیسرا لاشعور۔

ڈاکٹر مکرم: اور اس کا ثبوت؟

اکبر: فوق الشعور تو ظاہر ہے کہ انسان کا ایک واضح (بر سیرن) شعور ہے۔ لیکن جن واقعات کو وہ بھول چکا ہے وہ تحت الشعور میں ہوتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب ایسا واقعہ پیش آئے جس کا (براہ راست) تعلق گزشتہ فراموش کردہ واقعات سے ہو تو وہ بھولے ہوئے واقعات فوراً فوق الشعور میں آ جاتے ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا تحت الشعور بھی ہوگا (ہونا چاہئے) باقی رہا لاشعور، تو لاشعور میں شکل وصورت نہیں ہوتی یہ تو انسان کی بنیادی شخصیت اور مزاج ہوتا ہے۔

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر مکرم: اس کی وضاحت کیجئے۔

اکبر: دیکھئے! ہر انسان کی اپنی ایک امتیازی شخصیت ہوتی ہے۔ معاً اس کی سرشت میں صدہا صدہا سالوں سے اس کے آباؤ اجداد کے عادات و خصائل بھی شامل ہوئے ہوتے ہیں یہ عادات و خصائل اس کی بنیادی شخصیت میں کچھ اس طرح گھلے ملے ہوتے ہیں جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ اس کی فلاں عادت یا رجحان اس کی بنیادی شخصیت کی وجہ سے ہے یا وہ اسے آباؤ اجداد کی طرف سے اس کی شخصیت میں بطور وراثت منتقل ہوئی ہے اور اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ ہر ایک انسان میں اپنے والدین کی صورتوں کا عکس موجود ہوتا ہے مگر پھر بھی اپنی ایک امتیازی شکل بھی رکھتا ہے (تو) لاشعور کسی انسان کی بنیادی شخصیت اور مزاج کا نام ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب زید پہلی بار بکر سے ملتا ہے تو وہ اسے یا تو پسند آ جاتا ہے اور یا ناپسند۔

داؤد: کیا مطلب؟

اکبر: مطلب یہ کہ (اگر) زید و بکر ابھی تک ایک دوسرے کے لئے محض اجنبی تھے تو زید نے بکر کو کیوں پسند نہ کیا؟

ڈاکٹر مکرم: ہوسکتا ہے کہ بکر کی شکل وصورت اسے پسند نہ ہو۔

اکبر: ہاں! شکل کی ناپسندیدگی بھی اس کی ایک وجہ ہوسکتی ہے لیکن جزوی۔ کیونکہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جس وقت ان دونوں کا آمنا سامنا ہوجاتا ہے اور ایک کا پرتو دوسرے پر پڑ جاتا ہے تو ان دونوں کی انفرادی اور بنیادی شخصیتیں فوراً فیصلہ کردیتی ہیں کہ وہ (بکر) اسے پسند ہے یا ناپسند؟

ڈاکٹر مکرم: لیکن کبھی کبھی یہ اندازہ غلط بھی ثابت ہوجاتا ہے یعنی اگر ابتداء میں زید بکر کا

مخالف بھی ہو۔لیکن جب ان کے تعلقات قائم ہو جاتے ہیں تو آہستہ آہستہ یہ مخالفت بھی ختم ہو جائے گی۔

اکبر: بے شک! یہ درست ہے مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان دونوں کی سرشت میں ایک نہ ایک صفت مشترک ہوتی ہے۔مگر ان کے اوصاف کی اکثریت ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں تو اسی بناء پر ان کے باہمی تعلقات کے دوران وہ (مخصوص) مشترک وصف بھی ظاہر ہو جاتا ہے اور بکر کے ساتھ زید کی مخالفت میں کمی آ جاتی ہے۔

اشرف: (مگر) اس کے برعکس (خلاف) بھی تو ہو سکتا ہے۔

اکبر: ہاں! (مگر وہ اس طرح) کہ مثلاً ابتدائی طور پر عمر کو خالد بہت اچھا لگے لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ اس کا مخالف ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اولین ملاقات میں خالد کے وہ اوصاف ظاہر ہوتے ہیں جو ان دونوں کے درمیان مشترک ہوتے ہیں مگر جونہی ان کے تعلقات آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہیں تو خالد کے اندر (موجود) مخالفت کے اوصاف بھی بالفعل (ظاہر) ہو جاتے ہیں اور چونکہ کثرت تو انہی اوصاف کی ہوتی ہے لہذا وہ صرف ایک ہی مشترک وصف ان میں مدغم ہو جاتا ہے چنانچہ عمر خالد کی مخالفت پر اتر آتا ہے۔

ڈاکٹر مکرم: یہ بات محض قیاسیات پر مبنی ہے ثبوت اس کا کوئی نہیں۔

اکبر: ڈاکٹر صاحب! آپ کی طرف سے پیش کردہ آپ کے خواب کا نظریہ اس سے بھی زیادہ قیاسیات پر منحصر ہے یا اسے محض اندازہ بھی کہہ سکتے ہیں۔اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جب آپ کی عمر چالیس برس کی ہو جائے گی تو آپ کو زندگی کی نئی چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ڈاکٹر مکرم: مگر وہ کیسے؟

اکبر: (وہ ایسے) کہ انسان کے تحت الشعور میں جتنے واقعات بھی داخل ہیں تو (انسان) آہستہ آہستہ ان کو بھول جاتا ہے (لیکن) جب ان خیالات یا نقوش کی کثرت (بہتات) ہو جاتی ہے تو یہ ایک طوفان یا سیلاب کی شکل اختیار کر لیتے ہیں (پھر) یہ سیلاب لاشعور کے ساتھ معاونت کے لئے روانہ ہو جاتا ہے تو جونہی لاشعور سے آمنا سامنا ہوتا ہے تو اسی مقام میں دو طرح کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مکرم: کون کون سے حالات؟

اکبر: یہ کہ اگر وہ اشکال و نقوش جو پہلے ہی سے تحت الشعور میں مجتمع ہوتے ہیں اور وہ کسی انسان کے لاشعور (یعنی بنیادی شخصیت) سے متفق ہوں تو لاشعور ان کو بڑی آسانی سے اپنے ساتھ شامل کر لیتا ہے۔ لیکن اگر اس کے مخالف ہوں تو ان کو رد کر دیتا ہے اور اسی سے ایک بحران اور تصادم کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ تحت الشعوری اشکال مجبور ہوتے ہیں کہ وہ سیلاب کی طرح گزر جائیں مگر دوسری طرف (انسانی) لاشعور اس کا راستہ روک لیتا ہے تو یہی چیز ٹکراؤ اور تصادم کی صورت اختیار کر لیتا ہے چنانچہ (اس کے نتیجے میں) انسان مضطرب اور پریشان ہو جاتا ہے۔

اسلم: اب بات بنتی نظر آتی ہے۔

اکبر: تو میں اس لئے اس بات پر زور دے کر ڈاکٹر صاحب کو کہتا ہوں کہ ان کے لامذہبی کے افکار اس وقت تک موجود رہیں گے جب تک ان کے لاشعوری خیالات ایک سیلاب کی شکل اختیار نہ کر لیں اور ان کے لاشعوری افکار کے

بالمقابل نہ آجائیں۔

ڈاکٹر مکرم: (کیا مطلب) یعنی اگر لاشعور سے آمنا سامنا ہو جائے تو اس سے کیا رونما ہوگا؟

اکبر: (یہی کہ) آپ کا لاشعور صدہا سالوں سے مسلمان ہے اور آپ کے آباؤ اجداد کے خصائل و عادات اس میں موجود ہیں تو بالیقین آپ کے تحت الشعوری خیالات آپ کے لاشعوری خیالات سے شکست کھالیں گے اور آپ کا مذہبی تصور ابھر کر اس قدر غالب آجائے گا۔ کہ لامحالہ آپ کا فوق الشعور بھی اس سے متاثر ہو جائے گا (اسی بناء پر) افلاطون نے کہا تھا۔ کہ چالیس سالوں کی عمر میں کوئی انسان بھی ملحد نہیں رہ سکتا۔ اگر چہ بظاہر وہ اس کا اقرار کرے یا نہ کرے۔

اکرم: واقعی' ایسے کئی لوگ میرے مشاہدے میں بھی آئے ہیں۔

ڈاکٹر مکرم: (ہنستا ہے) دراصل یہ ان لوگوں کی ایک قسم کی کمزوری ہوتی ہے کیونکہ جب ایسے لوگ بڑھاپے کی عمر تک پہنچ جاتے ہیں تو اسی عمر میں مرنے کا خوف ان پر غالب آجاتا ہے اور اسی وقت نفس انسانی خوف مرگ سے نجات حاصل کرنے کے لئے مذہب کے دامن کو تھام لیتا ہے۔

اسلم: صوفی صاحب! معافی چاہتا ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب تحت الشعوری اشکال کا آمنا سامنا لاشعور سے ہو جاتا ہے اور یہی تحت الشعوری اشکال وغیرہ لاشعور کی بنیادی حیثیت کے مخالف بھی ہوں اور ان میں تصادم بھی پیدا ہو جاتا ہے تو تحت الشعوری اشکال کس گوشہ میں فنا ہو جاتی ہیں؟

ڈاکٹر مکرم: یہی سوال میں بھی کرنے والا تھا۔ اچھا ہوا آپ نے سبقت حاصل کر لی۔

اکبر: بہترین سوال ہے اور میں آپ کی خدمت میں عرض کروں گا۔ کہ لاشعور پختہ اور

غیر معتدل [1] ہوتا ہے جبکہ تحت الشوری سیلاب کی صورت غیر منظم ہوتی ہے اور بنیادی نہیں ہوتی چنانچہ لاشعور ان کو اپنے اندر ایسے جذب کر لیتا ہے کہ تحت الشعوری سیلاب میں بحیثیت مجموعی مدغم ہو جاتا ہے (نتیجتاً) لاشعوری شخصیت میں شامل ہو جاتا ہے (ظاہر ہے کہ) پھر وہ مخالفت کے قابل نہیں رہتا اس کے ساتھ ساتھ فوق الشعور۔ لاشعور کی متابعت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بعد ازاں فوق الشعور کے عمل کی وجہ سے جو نقوش تحت الشعور کی طرف منتقل ہوتے ہیں وہ تمام کے تمام وہی نقوش ہوتے ہیں لاشعور سے متحد اور متفق ہوتے ہیں۔ کیونکہ فوق الشعور کسی ایسے عمل کے قابل ہی نہیں رہتا جو لاشعور کے مخالف ہو اور یہی وجہ ہے کہ انسان خداوند عالم کی ہستی کا قائل ہو جاتے ہے (گویا) وہ اپنے خوابوں کی حقیقت کو سمجھ لیتا ہے۔

ڈاکٹر مکرم: اس کی وجہ؟

اکبر: ڈاکٹر صاحب! اس سے قبل کہ میں خوابوں کی حقیقت کے بارے میں کچھ عرض کروں میں آپ سے یہ پوچھنا پسند کروں گا (اور آپ بتا دیں) کہ کیا ہم خواب میں ایک ایسا انسان یا ایسا مقام دیکھ سکتے ہیں جو ہم نے کبھی نہ دیکھا ہو؟

ڈاکٹر مکرم: شاید۔ ہم نہیں دیکھ سکتے۔

اکبر: شاید نہیں۔ بلکہ یقیناً کہیے۔ مثلاً ایک مادر زاد اندھا کسی دوسرے انسان کی شکل و صورت (ہرگز) نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں وہ اس کی آواز کو سن سکتا ہے۔ دوسری طرف (حالت یہ ہے کہ) ہم اکثر اوقات خواب میں ایسے انسانوں اور مقامات کو

---

(۱) یہاں پر ''غیر معتدل'' نہیں بلکہ ''معتدل'' لکھنا درست ہوگا۔ مگر اصل کتاب کی جو نقل میرے پاس ہے اس میں ''غیر معتدل'' لکھا گیا ہے۔ جو قابل لحاظ ہے۔ مترجم

دیکھتے ہیں جن کو جاگنے کی حالت میں ہم نے کبھی نہیں دیکھا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر مکرم: یہ (درحقیقت) انسانی شعور اور تخیل کی اختراع کردہ ہوتے ہیں۔

اکبر: (نہیں ڈاکٹر صاحب) یہ قطعی طور پر ناممکن ہے۔ مگر صبر کیجئے۔ اپنے مدعا کی طرف آتا ہوں۔ آپ یہ فرما دیجئے کہ جو کام ہم جاگتے ہوئے نہیں کر سکتے یا بیداری کی حالت میں اسے ناممکن سمجھتے ہیں تو کیا خواب میں بھی اس کام یا عمل کو ناممکن سمجھتے ہیں؟

ڈاکٹر مکرم: صوفی صاحب! آپ نے ایسا سوال کیا ہے جس کا ظاہری موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تاہم میں تسلیم کرتا ہوں کہ (انسانی) شعور جو کام بیداری کی حالت میں ناممکن تصور کرتا ہے وہ خواب میں بھی ناممکن ہی ہوتا ہے۔

اکبر: شکریہ! اب میری عرض یہ ہے کہ انسان تین قسم کے حواس رکھتا ہے یعنی عقلی، مثالی اور مادی، گویا انسان ایک مجرد روح کی حیثیت میں عقلی حواس کا مالک تھا۔ پھر جب عالم ارواح یعنی عالم عقل سے عالم مثال میں لایا گیا تو اس مقام پر اس کے عقلی حواس کے ساتھ مثالی حواس بھی شامل ہو گئے۔ کچھ عرصہ اسی مقام میں رہنے کے بعد اس کو (انسان کو) عالم مادیت میں لایا گیا چنانچہ یہاں پر اس کو مادی حواس بھی ودیعت کیے گئے۔

ڈاکٹر مکرم: مگر صوفی صاحب! یہ بات محض قیاس پر مبنی ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

اکبر: آپ ذرا صبر سے کام لیں۔ میری گفتگو کے دوران اس کا ثبوت بھی سامنے آ جائے گا۔ (بات یہ ہے کہ) انسان اسی مادی دنیا میں تین قسم کے حواس کا مالک ہے۔ (اس طرح کہ) اس کے ذہن میں پہلے پہل اشیاء کا تصور عقلی تھا۔ پھر

مثالی صورت اختیار کی یعنی مجرد اشیاء کی صورتوں کے ساتھ مثالی صورتیں بھی شامل ہوئیں۔ گویا یہاں پر اس کے علم الاشیاء نے مزید در مزید ترقی حاصل کی۔ بعد ازاں جب یہی انسان اس جہاں میں آ گیا اور اس کو مادی حواس بھی دے دیئے گئے تو (ظاہر ہے) اس کے اشیاء کا علم مزید نکھر گیا اور اس آیت قرآنی کا مطلب بھی یہی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تمام و کمال اشیاء کا علم دیا گیا۔

**و علم ادم الاسماء کلھا** ..................... آیت ۱۳۱ البقرہ

(اور علم دے دیا اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو (ان کو پیدا کر کے) سب چیزوں کے اسماء کا)۔ البقرہ آیت ۳۱

اشرف: بڑی اچھی بحث چل پڑی ہے۔

اکبر: تو گویا اشیاء کی صورتوں کی ایک زنجیر بن گئی۔ جس کا تسلسل انسانی ذہن میں ہر آن رواں دواں ہوتا ہے اور زنجیر کی ہر کڑی کے بعد وہ کڑی آتی ہے جس کا تعلق پہلی کڑی سے استوار ہوتا ہے اور یہ سلسلہ جاگتے ہوئے اور خواب میں (دونوں حالتوں میں) جاری و ساری رہتا ہے۔ جاگنے کی حالت میں ہم اسی سلسلے کو خیال یا فکر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن (برعکس) نیند کی حالت میں یہ سلسلہ متشکل حالت یا چلتی پھرتی صورتوں میں دیکھتے ہیں اور اسی چیز کو ہم ''خواب'' کہتے ہیں۔ [1] کہ ہم نے خواب میں دیکھا ہے۔

ڈاکٹر مکرم: آپ نے ابھی تک تین اقسام کے حواس کا ثبوت فراہم نہیں کیا۔

---

(۱) مطلب یہ ہے کہ جاگتے ہوئے جب ہم کسی چیز کو خیال یا فکر میں لاتے ہیں تو وہ ایک موہوم قسم کا تصور ہی ہوتا ہے۔ اسی کو خیال کہا گیا ہے۔ مگر جب خواب میں خیال یا فکر کرتے ہیں تو وہ شے باقاعدہ متحرک متکلم یا متشکل صورت میں دیکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ خیال ہی ہوتا ہے۔ مگر خواب میں متشکل ہوتا ہے۔ مترجم

اکبر: تو اب میں یہ عرض کروں گا کہ ڈاکٹر صاحب یہ بات آپ کے ذاتی تجربہ میں بھی آئی ہو گی یا کم از کم سنا تو ضرور ہو گا کہ کبھی کبھی انسان خواب میں اڑتا بھی ہے۔

ڈاکٹر مکرم: ٹھیک ہے مگر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان ہمیشہ پرندوں کو اڑتا ہوا دیکھتا ہے تو خواب میں بھی یہی تصور کارفرما ہوتا ہے۔ دوسری بات علم نفسیات کی رو سے انسان کے تحت الشعور میں ترقی کی امید موجود ہے۔ بنابریں وہ اسی لئے اپنے آپ کو خواب میں بھی اڑتا ہوا دیکھ لیتا ہے۔

اکبر: ڈاکٹر صاحب! ذرا غور وفکر سے کام لیں اور یہ حقیقت تو آپ نے خود بھی تسلیم کی ہے کہ جو کام انسان بیداری کی حالت میں ناممکن تسلیم کرتا ہے تو خواب میں بھی اس کے لئے ناممکن ہو گا۔ اب آپ بیداری کی حالت میں فکر کریں کہ کیا آپ بیداری کی حالت میں اڑ سکیں گے؟ کبھی نہیں! پھر سوال یہ ہے کہ خواب میں کیونکر اڑنے پر قادر ہوتے ہیں؟ چنانچہ اس حقیقت سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ خواب کی حالت میں مادی حواس معطل ہوتے ہیں چنانچہ اڑنا بھی ممکن نہیں سمجھتا۔ لیکن (اس کے برعکس) مثالی حواس اڑنے کے فعل کو ممکن سمجھتے ہیں اور اڑنے کے دوران انسان اس خطرے سے بے خوف ہوتا ہے کہ نیچے گر جائے گا۔ یعنی گرنے کے خیال سے بھی بے فکر ہوتا ہے۔

اکرم: اب آگے فرمایئے!

اکبر: ایک اور مثال بھی حاضر ہے۔ جناب ڈاکٹر صاحب! آپ خواب میں عوامی ایکسپریس میں کراچی کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر اپنے دوستوں کے ہاں دس دنوں کی ضیافت کے مزے لوٹ کر واپس پشاور تشریف لے آتے ہیں۔ تو یہ دس دنوں کی گنتی مادی حواس ہی مقرر کرتے ہیں جبکہ خواب میں مثالی

حواس کے ذریعے (معیاد یعنی دس دن) سب کچھ چند دقیقوں پر مشتمل ہوتا ہے
اور یہ خواب میں تین اقسام پر مشتمل ہوتے ہیں (۱) مبشرات یعنی رویائے
صادقہ (سچے خواب) (۲) اضغاث احلام یعنی معدے یا کسی اور قسم کی خرابی کی
وجہ سے اور (۳) اپنے خیالات۔

اشرف: اچھا تو اس کی کوئی مثال بھی پیش کر سکتے ہیں؟

اکبر: کیوں نہیں! حضور نبی کریم ﷺ کا قاعدہ مبارک تھا کہ جب فجر کی نماز ادا
فرماتے تو اپنے صحابہ کرامؓ سے معلوم فرماتے کہ ان میں سے کسی نے خواب دیکھا
ہے؟ ایک روز ایک صحابیؓ نے عرض کی کہ حضور ﷺ میں نے رات کو خواب میں
دودھ پیا ہے۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "تمہارے علم میں اضافہ ہوگا۔"
ایک اور موقع پر جب آنحضرت ﷺ نے پوچھا تو حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ میں
نے رات کو خواب میں دیکھا ہے کہ میں نے ایک دراز قبا (چغہ) پہنا ہے تو
آنحضرت ﷺ نے فرمایا تمہارے علم میں اضافہ ہوگا۔"

اسلم: یہ تو مختلف قسم کے خوابوں کی ایک ہی قسم کی تعبیر بیان فرمائی گئی۔

اکبر: فی الحقیقت یہ بات ہر انسان کی ذہنی استعداد اور کیفیت سے تعلق رکھتی ہے۔ جس
صحابیؓ نے خواب میں دودھ پیا تھا تو اس کے ذہن پر علم کا جز مجرد پرتو پڑا تھا اور ان
کے مادی حواس نے علم کے اس مجرد پرتو کو محسوس کیا تو اس کو دودھ کی شکل میں
تبدیل کر دیا۔ کیونکہ علم میں حکمت ہوتی ہے اور دودھ میں مکھن۔ اور حضرت عمرؓ
کے ذہن نے علم کے مجرد پرتو کو قبا کی صورت دی تھی اور قبا عموماً علماء حضرات ہی
پہنا کرتے ہیں۔

مولوی احمد: یہ دونوں روایتیں صحیح ہیں۔

اکبر: علاوہ ازیں رویائے صادقہ کی بے شمار مثالیں تاریخ میں بھی موجود ہیں جن کو ہم ''اتفاقی''، نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً اصحابؓ بدر میں ایک صحابیؓ (جو شہید ہو گئے تھے) حضرت عمرؓ کو خواب میں آئے اور ان سے کہا کہ فلاں فلاں اشخاص کا میں مقروض ہوں تو ہمارے گھر میں جہاں میری چارپائی پڑی رہتی تھی اس کے نیچے میں نے دراہم دفن کئے تھے وہ دراہم نکال کر میرے قرض خواہوں کو دے دیئے جائیں۔

ڈاکٹر مکرم: مگر میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ یہ سب کچھ محض اتفاقاً ہوا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص روزانہ ایک ہی راستہ پر آتا جاتا ہے اسی راستے میں اتفاقاً اس کے ایک بٹوہ (ہمیانی) مل جاتا ہے۔ کھول کر دیکھتا ہے تو اس میں اچھی خاصی رقم موجود ہوتی ہے۔ تو فرمایئے کہ یہ سب کچھ اتفاقاً ہوتا ہے یا نہیں؟

اکبر: میں نے عرض کیا ہے کہ دانشمندوں کے نزدیک اتفاق کوئی چیز ہی نہیں اور یہ سب کچھ علت و معلول سے متعلق ہے اور علتیں چار قسم کی ہیں (۱) علت فاعلی یعنی فعل کرنے والا (۲) علت مادی (۳) علت صوری یعنی اس چیز کی صورت یا شکل اور (۴) علت غائی یعنی وہ مقصد جس کے لئے وہ چیز بنائی گئی ہے تو ڈاکٹر صاحب کے ذکر کردہ بٹوے کا پایا جانا بھی انہی علتوں سے باہر نہیں۔

اشرف: مگر (میں حیران ہوں) کہ جبر و اختیار کا ان امور سے کیا تعلق ہے؟

اکبر: وہ یہ کہ اس معاملہ میں مولوی احمد صاحب نے جو تبصرہ فرمایا تھا۔ اس تبصرہ کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو صاف طور پر معلوم ہوگا کہ شرعی مشیت میں انسان مختار ہے اور ہمارا مشاہدہ ہے کہ بہت سے امور میں وہ اپنے نفس کی خواہشات کو قابو میں رکھتا ہے۔ جس کو ضبط نفس کہا جاتا ہے اور اسی بناء پر انسان مختار ہوتا ہے۔ (جبکہ مشیت تکوینی کی رو سے مجبور بھی ہوتا ہے)

داؤد: مگر (میرے نزدیک) اس قسم کے اختیار میں بھی جبر شامل ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے اختیار سے جبر ہی کے ذریعے کام لیا جاتا ہے (یعنی مجبوراً)

اکبر: داؤد خان! آپ کے نظریات میں تضاد ہے۔ آپ مکمل جبر کے بھی قائل ہیں اور اختیار کے بھی اور اس پر مستزاد یہ کہ اس اختیار کو بھی جبر سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے نظریات سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اور تو اور آپ بذات خود بھی اپنے نظریات سے مطمئن نہیں ہیں۔

اشرف: اچھا تو اب ذرا ضبط نفس کے متعلق بھی کوئی تاریخی واقعہ بیان کریں۔

اکبر: (مسکرا کر) ابھی ابھی آپ نے فرمایا تھا۔ کہ اس معاملے کا جبر و اختیار سے کیا تعلق! مگر خیر سن لیجئے۔ یہ واقعہ سچا بھی ہے اور تاریخی بھی۔ ہوا یہ کہ ایک روز خلیفہ ہارون الرشید اپنی بی بی زبیدہ سے شطرنج کھیل رہا تھا اس دوران کسی چال کے سلسلے میں دونوں میاں بیوی کا اختلاف پیدا ہوگیا۔ اختلاف نے باقاعدہ جھگڑے کی صورت اختیار کی اور دونوں کا غصہ انتہاء کو پہنچ گیا۔ اسی غصہ کی حالت میں زبیدہ نے اپنے خاوند سے کہا کہ:

''تم دوزخی ہو۔''

خلیفہ نے بھی غصہ کی حالت میں جیسے کا تیسا یہ جواب دیا کہ:

''اگر میں دوزخی ہوں تو تم مجھ پر طلاق ہو۔''

چنانچہ دونوں نے ایک دوسرے سے جدائی اختیار کی۔ جب دونوں کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوگیا۔ تو پچھتائے اور پشیمان ہوئے۔ چنانچہ خلیفہ نے مجبور ہو کر قاضی ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ سے مشورہ کیا۔ قاضی صاحب بھی پریشان ہو گئے اور گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ خلیفہ نے دوبارہ پوچھا کہ ''قاضی صاحب! اب اس مسئلے

کا کیا علاج فرمائے گا؟'' قاضی صاحب نے عرض کیا کہ ''امیر المومنین! عالم الغیب تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور وہی جانتا ہے کہ آپ جنتی ہیں یا دوزخی؟ اس لئے ہم اس مسئلے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔'' خلیفہ ہارون نے کہا کہ قاضی صاحب!'' آپ دوسرے علماء سے بھی مشورہ کریں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی عالم کے پاس اس مسئلے کا کوئی حل موجود ہو؟'' تو قاضی صاحب نے مختلف علماء سے اس مسئلے کے بارے میں پوچھا مگر انتہائی سوچ بچار کے بعد سب نے اپنی بے بسی کا عذر پیش کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات عوام کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ حتیٰ کہ حضرت امام شافعیؒ اور ان کے ہم سبق طلباء تک بھی پہنچی۔ حضرت امام شافعیؒ اس زمانے میں ایک نوخیز طالب علم تھے جب ان کو اس واقعے کا علم ہوگیا تو فرمانے لگے کہ قاضی ابو یوسف جیسے عالم فاضل شخصیت بھی اس معمولی نوعیت کے مسئلے کو حل نہ کر سکے؟ ہم مکتب ساتھیوں میں سے ایک طالب علم نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ اس مسئلے کو حل کر سکتے ہیں؟ تو انہوں نے ہاں میں جواب دیا۔ ہوتے ہوتے یہ بات قاضی ابو یوسف تک بھی پہنچ گئی چنانچہ انہوں نے حضرت امام شافعیؒ سے رابطہ قائم کیا۔

اشرف: واقعہ عجیب بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اچھا تو آگے فرمائیے۔

اکبر: حضرت امام شافعیؒ کو قاضی ابو یوسف نے بلایا اور بلا کر ان سے پوچھا ''نوجوان! وہ تم ہی ہو جس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ آپ امیر المومنین کا مسئلہ حل کر سکتے ہیں؟'' حضرت امام شافعیؒ نے اثبات میں جواب دیا تو قاضی صاحب خلیفہ کے پاس چلے گئے اور ان کو اطلاع دی۔ امیر المومنین نے خوشی کا اظہار کیا اور حضرت امام شافعیؒ کو دربار میں طلب کیا۔ قاضی صاحب کے ہمراہ دیگر متبحر علماء بھی تھے۔ سب

نے مسئلہ حل کرنے والے نوخیز طالب علم سے ملاقات کی۔ بزعم خود خلیفہ نے بھی ان سے معلوم کیا کہ

''نوجوان! درپیش مسئلہ کو حل کرنے کا دعویٰ آپ نے کیا ہے؟''

حضرت امام شافعیؒ نے جواب دیا کہ ''ہاں! یا امیر المومنین! اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں یہ مسئلہ حل کروں گا'' یہ سن کر خلیفہ نے فرمایا ''تو پھر دیر نہ کیجئے۔ بسم اللہ کیجئے!''

اسی وقت حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا ''امیر المومنین اس وقت میری حیثیت قاضی کی ہے لہذا آپ تخت سے نیچے اتریں تا کہ میں تخت پر بیٹھ جاؤں اس کے بعد آپ مجھے اپنا مقدمہ باقاعدگی کے ساتھ پیش کریں۔''

مولوی احمد: سبحان اللہ! ہمارے بزرگ کس قدر غیور اور پاک باطن تھے؟

اشرف: بے شک اور بجا طور پر ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ حق تعالیٰ نے مسلمانوں میں ایسے صاحبان جرات اور حق پرست لوگ پیدا فرمائے ہیں۔

اکبر: تو سنیے! خلیفہ ہارون الرشید اپنے تخت سے نیچے اترا' حضرت امام شافعیؒ جا کر تخت پر رونق افروز ہوئے۔ بعد ازاں خلیفہ سے فرمایا کہ اب اپنا مقدمہ پیش کریں۔ چنانچہ خلیفہ نے اپنی بی بی کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے سارا واقعہ من وعن پیش کر دیا۔ حضرت امام شافعیؒ نے کچھ دیر سوچ کر فرمایا کہ اب جو کچھ میں پوچھنا چاہتا ہوں آپ اس کا جواب دیں۔ خلیفہ نے کہا کہ میں ضرور سچ سچ کہوں گا۔ تو حضرت امام شافعیؒ نے ان سے پوچھا کہ:

''یاد کیجئے بلوغ کی حد تک پہنچنے کے بعد آپ کسی ایسے واقعے سے بھی دوچار ہوئے ہیں کہ آپ گناہ کرنے پر قادر تھے مگر اللہ تعالیٰ کے خوف سے گناہ کے

مرتکب نہ ہوئے ہوں۔ خوب اچھی طرح سوچ بچار کے بعد جواب دیں''

خلیفہ ہارون الرشید نے جواب دیا کہ:

''خدائے وحدہ لاشریک گواہ ہے کہ صرف ایک بار ہی نہیں بلکہ کئی کئی بار ایسے مواقع ہاتھ آئے اور میں گناہ کرنے پر قادر بھی تھا مگر واللہ صرف خدا کے خوف سے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔''

یہ سماعت فرما کر حضرت امام شافعی نے فوراً فتویٰ دے دیا کہ:

''آپ جنتی ہیں!''

اس پر حاضر علماء حضرات نے کھسر پھسر شروع کی اور قاضی ابو یوسف نے ان سے دریافت کیا کہ اے محمد بن ادریس شافعیؒ آپ کے اس فتویٰ کی دلیل کیا ہے؟

تو حضرت امام شافعیؒ نے جواب دیا کہ

ارشاد خداوندی ہے کہ:

و اما من خاف مقام ربه و نهى النفس عن الهوى 0 فان الجنة هى الماوى 0 سورۃ مبارکہ النزعات آیت ۴۱۔۴۲

ترجمہ: اور جو شخص دنیا میں اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو (حرام) خواہش سے روکا ہوگا سو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا۔

یہ سن کر طبقہ علماء کی نشستوں سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔ خود قاضی ابو یوسف صاحب نے بھی کہا کہ نوجوان! تمہارا فتویٰ بالکل صحیح ہے اور تعجب ہے کہ ہمارا دھیان اس طرف کیوں نہیں گیا۔ ذالک فضل الله يوتيه من يشاء سورۃ الجمعہ مبارکہ پارہ ۲۸

اشرف: جب نوجوانوں میں علم و فضل کی یہ حالت تھی تو سوچا جا سکتا ہے۔

اکبر: اسی وجہ سے تو حضرت امام شافعیؒ کو مسلمانوں نے امام کے طور پر قبول کیا اگرچہ ان کے مخالفین بھی کچھ کم نہ تھے۔

اسلم: دراصل ہر روشن خیال شخصیت کے مخالفین بھی ضرور ہوا کرتے ہیں۔

اکرم: وجہ یہ ہے کہ تمام اشیاء اپنے اضداد کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں تو جب کسی کو برا کہا جاتا ہے تو اس کے ہنر بھی سامنے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

داؤد: یہ بعض لوگ حضرت امام شافعیؒ کی مخالفت کیوں کرتے تھے؟

اکبر: حضرت امام شافعیؒ خود بھی حضرت عبدالمطلب کی اولاد میں سے تھے لیکن جس والہانہ جذبے کے ساتھ وہ بنی فاطمہؓ سادات کا احترام فرماتے تھے۔ تو اس لحاظ سے وہ شاید حد سے گزر گئے تھے چنانچہ بعض علماء ان کو رافضی سمجھنے لگے تھے۔

اشرف: قدرت خداوندی ہے کہ بلند ترین مرتبہ رکھنے والی شخصیتوں کو ملا صاحبان پسند نہیں کرتے۔

اکبر: (حضرت امام شافعیؒ کا ایک اور واقعہ بھی سن لیں) ایک روز حضرت امام شافعیؒ اپنے حلقہ درس میں اپنے طلبہ کو لیکچر دے رہے تھے اسی دوران میں وہ متعدد بار اپنی نشست گاہ سے اٹھ کر احتراماً کھڑے ہوتے اور تھوڑی دیر کے بعد بیٹھ جاتے۔ چنانچہ ایک شاگرد نے دریافت کیا کہ حضرت اٹھ کر احتراماً کھڑے ہونے اور پھر بیٹھ جانے کا سبب کیا ہے؟ تو حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا کہ دیکھو سامنے گلی میں چھوٹے چھوٹے بچے گیند سے کھیل رہے ہیں جب وہ گیند اس طرف آتی ہے تو اسے اٹھانے کے لئے ایک سید بچہ آتا ہے تو اس سید زادے کے احترام میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔

مولوی احمد: سبحان اللہ!

اکبر: جونہی بعض لوگوں نے اس بات کو خوب ہوا دی کہ حضرت امام شافعیؒ رافضی ہیں تو وہ ایک بہترین شاعر بھی تھے اور ان کے جواب میں یہ اشعار کہہ دیئے

قالو اترفضت قلت کلا

ما ارفض دینی ولا اعتقادی

وان کان حب ال محمد برفض

فانی ارفض العبادی

اشرف: ان اشعار کا ترجمہ بھی عنایت ہو۔

اکبر: (بہتر تو ان اشعار کا ترجمہ یہ ہے کہ) لوگ کہتے ہیں کہ تم (شافعیؒ) رافضی ہو تو نہیں رفض نہ تو میرا دین ہے اور نہ اعتقاد۔ لیکن اگر اولاد رسولؐ سے محبت رکھنا رفض ہو تو تمام لوگوں سے میں بڑا رافضی ہوں۔

اشرف: سبحان اللہ!

اکبر: یہی وجہ ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کے مذہب میں نماز میں درود شریف پڑھنا فرض ہے وہ فرماتے ہیں

یا ال رسول اللہ حبکم فرض

فی القرآن انزلہ

کفا کم من عظیم الفضل انہ

من لم یصل علیکم لا صلواۃ لہ

یعنی اے اولاد رسول آپ سے محبت کرنا فرض ہے جو قرآن میں بھی نازل ہوا ہے اور آپ کی بڑی فضیلت کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جو کوئی آپ لوگوں پر درود نہ بھیجے اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔

مولوی احمد: حالانکہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مذہب میں درود فرض نہیں۔

اکبر: دراصل اسی قسم کے اختلافات نے مسلمانوں میں فرقوں کو جنم دیا ہے۔ رسول ﷺ کے اصحاب (رضی اللہ عنہم) میں سے اگر کوئی شخص ایک صحابیؓ کو افضل مانے تو فرمایئے اس میں کیا حرج ہے؟ جبکہ خود آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میرے اصحابؓ کی مثال ستاروں کی طرح ہے ان میں سے جس ایک کی بھی اقتداء کی جائے وہ ہدایت پالے گا اور میں (اکبر) نے ایک کتاب میں پڑھا ہے اور وہ حضرت امام مالکؒ کا ایک قول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ساری امت میں افضلیت کا درجہ حضرت خاتون جنت سیدہ فاطمہؓ کو حاصل ہے۔

مولوی احمد: معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی افضلیت کے قائل تھے۔

اکبر: ان کی ایسی کوئی تحریر تو میری نظر سے نہیں گزری ہے البتہ ان کے پیروؤں سے ایک روایت ضرور سنی ہے۔

مولوی احمد: وہی بتادیں۔

اکبر: آپ سب دوستوں کو معلوم ہے کہ حضرت خواجہ خواجگان معین الدین چشتی قدس سرہ کے عرس مبارک کے موقع پر میں اجمیر شریف جاتا ہوں۔

اشرف: ہاں! یہ ہمیں معلوم ہے۔

اکبر: ایک بار میں اجمیر شریف گیا تھا اور جب خواجہ غریب النواز کے روضہ مبارک پر حاضری دی تو دیکھا کہ دو عرب بھائی بھی دعا و فاتحہ میں مصروف ہیں۔ بخدا مجھے بہت ہی اچھے لگے۔ میں ان کے قریب ہوگیا اور ٹوٹی پھوٹی عربی میں ان سے پوچھا کہ آپ لوگ مسلمانوں کے کس فرقے اور مذہب سے تعلق رکھتے ہیں؟

انہوں نے بتایا کہ ہم شافعیؒ کے مذہب پر ہیں۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ حضرت امام شافعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحابؓ میں کس صحابیؓ کو افضل مانتے تھے۔

مولوی احمد: اچھے موقع پر ایک اچھا سوال تھا؟

اکبر: ان میں سے ایک نے جواب دیا کہ یہی سوال ایک بار حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ نے بھی کیا تھا کہ یا رسول ﷺ آپ کے صحابہؓ میں کون سا صحابیؓ آپ کو بہت پیارا ہے؟ (اور یہ سوال حضرت عائشہؓ نے امتحان کے طور پر کیا تھا)

اکبر: رسول ﷺ نے جواب دیا کہ تمہارا باپ ابوبکرؓ۔ ام المومنین نے پوچھا ان کے بعد؟ رسول ﷺ نے جواب دیا کہ عمر بن الخطاب۔ ام المومنین نے پوچھا اور ان کے بعد؟ حضور ﷺ نے جواب دیا کہ عثمانؓ بن عفان۔ حضرت صدیقہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ کیوں علیؓ کو بھول گئے؟ تو آنحضرت مسکرائے اور ارشاد فرمایا تم نے غیروں کے متعلق پوچھا تھا اور جہاں تک علیؓ کا تعلق ہے تو وہ تو میری جان ہے ان کے متعلق کیا پوچھنا؟

یہ روایت میں نے ان عربوں کی زبانی سنی تھی۔ نہیں کہہ سکتا کہ یہ احادیث کی کتابوں میں موجود ہوگی یا نہیں؟

اشرف: یہ باتیں سب اچھی ہیں مگر جبر واختیار کے مسئلہ پر بحث کچھ رک سی گئی ہے۔

اکبر: اسی سلسلہ میں ضبط نفس کی بات چل نکلی تھی اور یہ تو معلوم ہے کہ انسان ضبط نفس کی قدرت رکھتا ہے اور اسی قدرت رکھنے کی وجہ سے مختار ثابت ہوتا ہے دوران گفتگو حضرت امیر المومنین علیؓ کا نام بھی آیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہاں ان کا بھی ایک قصہ بیان کردوں۔

اکبر: کسی جہاد میں حضرت علیؓ کا مقابلہ ایک انتہائی شہ زور مشرک سے آن پڑا تھا کچھ دیر مقابلہ کرنے کے بعد حضرت علیؓ نے اس کو گرا دیا اور اس کے سینے پر بیٹھ کر خنجر نکال دیا۔ وہ مشرک اور تو ہر طرح سے بے بس تھا مگر نیچے سے جناب امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کے مبارک منہ پر تھوک دیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فوراً اس کے سینے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور خنجر کو غلاف میں ڈال دیا یہ دیکھ کر اس مشرک کو بڑا تعجب ہوا۔ اوپر سے لے کر نیچے تک حضرت علیؓ کو دیکھا اور ان سے پوچھ لیا کہ علیؓ! مجھے قتل کرنا تو آپ کے لئے آسان تھا۔ پھر بھی آپ نے مجھے زندہ چھوڑ دیا۔ یہ کیوں؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ ہم مسلمان تم لوگوں سے للہ فی اللہ لڑتے ہیں اسلئے کہ فتنہ اور فساد ختم ہو۔ لیکن جس وقت تم نے میرے منہ پر تھوک دیا تو مجھے تم پر ذاتی غصہ آیا اور اگر میں اس وقت تمہیں قتل کرتا تو یہ قتل (فعل) خدا کے لئے نہیں بلکہ میری نفسانی خواہش کے لئے ہوتا جبکہ ہم (مسلمان) اپنے نفس کے لئے کسی کو قتل نہیں کرتے۔ اسی (عبرت انگیز) واقعہ کے متعلق حضرت مولانائے قدس سرہ (اپنی مثنوی) میں فرماتے ہیں

او خدو انداخت بر روئے علی

افتخار ھر نبی و ہر ولی

(یعنی مقابل کافر نے اس علیؓ کے منہ پر تھوکا جس کے چہرے پر ہر نبی اور ہر ولی فخر کرتا ہے)

ظاہر ہے کہ جب اس کافر نے اسلامی تعلیمات کا یہ مکمل نمونہ ملاحظہ کیا تو فوراً ایمان لے آیا۔ (مقصد یہ کہ) یہ ضبط نفس کی ایک اور نظیر تھی اور اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ انسان مختار ہے اور کلی طور پر مجبور نہیں۔

اشرف: کیا خیال ہے؟ رات کافی حد تک گزر چکی ہے (یعنی بحث ختم کرتے ہیں)

مولوی احمد: ہاں! آج رات اتنا ہی کافی ہے۔

اشرف: اس کے بعد کس کا نمبر ہوگا؟

داؤد: میرے خیال میں کل اکرم کو موقع دینا چاہئے پھر دیکھیں گے کہ وہ فلسفہ جبر و اختیار کے متعلق کیا نظریہ رکھتے ہیں؟

اکرم: میں اس عزت افزائی کے لئے آپ سب کا شکر گزار ہوں۔ میرے ناقص خیال میں جو کچھ ہوگا پیش کر دوں گا۔

اشرف: اچھا۔ تو شب بخیر

(سب دوست اپنے اپنے گھروں کو جاتے ہیں۔)

# پانچویں مجلس

(معمول کے مطابق تمام احباب اشرف خان کے حجرے میں جمع ہوگئے۔ سامنے ایک بڑی میز پر پلیٹوں میں انگور رکھے گئے تھے۔ مصافحوں اور معانقوں کے بعد اشرف نے انگوروں کے متعلق بات کی اور کہا کہ)

اشرف: یہ میرے اپنے باغ کے انگور ہیں۔ ان کے قلم میں نے کابل میں اپنے ایک دوست کے ذریعے حاصل کئے تھے۔ تو بسم اللہ کیجئے۔

مولوی احمد: ہاں صاحب! اول طعام۔ بعدہٗ کلام!

داؤد: بلاشبہ۔ اچھے اور معیاری انگور ہیں۔

اسلم: غیر معیاری انگور بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ہر چیز اپنی اصل کی ترجمان ہوتی ہے۔

داؤد: (درحقیقت) ہر چیز کا خالق حق تعالیٰ ہے۔

اسلم: ہر برے اور ہر بھلے کا؟

داؤد: یقیناً!

اسلم: گویا حق تعالیٰ خیر کا بھی خالق ہے اور شر کا بھی۔

داؤد: بالکل!

اسلم: گویا آپ کے خیال میں انسان خدا کے ارادے سے شر کا مرتکب ہوتا ہے اور اگر آپ کا مطلب یہی ہو تو ..................

اشرف: دیکھئے۔ آپ دونوں قبل ازیں اپنا اپنا عندیہ پیش کر چکے ہیں آج اکرم بولیں گے۔

اکرم: تو میرے نزدیک سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ اگر انسان مجبور ہو تو یہ کیوں مجبور

ہے اور اگر مختار ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ من بعد اگر انسان مجبور ہو تو کس کے مقابلے میں مجبور ہے؟ اور (بالفرض) اگر مختار ہو تو کس کے مقابلے میں؟ کیا انسان اپنے نفس کے مقابلے میں مجبور ہے؟ یعنی کیا اس کی وجہ وہ اوصاف ہیں جو انسان کی فطرت میں موجود ہیں اور بنی آدم سے ان اوصاف کے تقاضوں کے مطابق افعال کا ارتکاب ہوتا ہے۔ اب اگر ایسا مان لیا جائے تو پھر تو نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ بھی جو کچھ کرتا ہے یا جو کچھ اس نے کیا ہے تو وہ بھی اپنی صفات سے مجبور ہوگا۔ لیکن ہمارے مشاہدے کے مطابق ایسا نہیں۔ بے شک انسان ابتدائی طور پر اپنے نفسانی اوصاف کے مقابلے میں کسی حد تک مجبور ہوتا ہے لیکن جوں جوں اس کے علم میں اضافہ اور ترقی ہوتی جاتی ہے اسی نسبت سے اس کے اختیار و مختاریت میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اسی انسان نے آہستہ آہستہ طبعیت پر کنٹرول حاصل کرنا شروع کر دیا اس نے آگ کا انکشاف کیا پھر اسی آگ سے کام لینا شروع کیا اور آج بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ہوائی جہاز اور راکٹ بنالئے گئے ہیں۔ (انسان) چاند تک پہنچ گیا اور آگے معلوم نہیں کہاں کہاں تک رسائی حاصل کرے گا؟ اس کا اندازہ ہم انسان کی موجودہ ترقی کی رفتار سے لگا سکتے ہیں۔

**داؤد:** مگر اس ترقی کی ساری قابلیت اور استعداد حق تعالیٰ نے انسان کو بخشی ہے۔

**اکرم:** آپ کی بات درست ہوگی مگر (فرمایئے) اس قابلیت سے کام کس نے لیا؟ خدا نے یا انسان نے؟

**اسلم:** داؤد خان! اکرم کو موقع دیں کہ وہ اپنی بات کو آگے بڑھائے۔

**داؤد:** بہتر تو ارشاد ہو!

اکرم: یہاں پر میں چند فلاسفہ کی آراء پیش کرنا پسند کروں گا اور اس کے بعد اپنے اصل مدعا کی وضاحت کروں گا۔ مشہور جرمن فلاسفر کانٹ کہتا ہے کہ طبعی جبر اختیار سے متناقص ہے۔ طبعیت میں علت و معمول کے جبری قوانین جاری ہیں (اور) ہر حادثہ اور ہر حرکت ایک علت کا نتیجہ ہوتی ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس جبری دنیا میں ایک مختار ارادہ بھی موجود ہو؟ جبر و اختیار کا ظاہری تناقص واضح (اور) جبر و اختیار کے مقامات ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا ایک دوسرے سے تصادم نہیں ہوتا۔ انسان دو دنیاؤں کا رہنے والا ہے (یہ) اپنی معنوی طبعیت کے رو سے اختیار اور آزادی سے تعلق رکھتا ہے اور (اپنی) مادی طبعیت کے رو سے جبر کی دنیا سے متعلق ہے۔

اشرف؛ پر مغز اور معقول بحث ہو رہی ہے۔

مولوی احمد: میرے خیال میں تو بیان و گفتگو کا انداز مختلف ہے ورنہ میرے پیش کردہ دلائل کی تائید ہو رہی ہے کہ تکوینی مشیت کے اعتبار سے انسان مجبور ہے اور شرعی مشیت کے رو سے مختار ہے۔

اکرم: خیر! تو جس وقت کانٹ انسانی اخلاق کی بات کرتا ہے تو اسی ضمن میں جبر و اختیار کا مسئلہ خود بخود جنم لے لیتا ہے۔ کانٹ کہتا ہے کہ ایک عمل وہ اخلاقی حیثیت رکھتا ہے جو بطور فرض ادا کیا گیا ہو۔ اگر ایک آدمی کوئی عمل (کام) کسی اور کے حکم سے کرتا ہو تو یہ اچھے اخلاق میں شمار نہ ہوگا (کیونکہ) اخلاقی عمل وہ ہوگا کہ فرض کے طور پر کیا گیا ہو اور یہ اس لئے کہ یہ عمل ذاتی طور پر اچھا ہوگا۔ تو جب بات اخلاق تک پہنچتی ہے تو درمیان میں جبر و اختیار کا مسئلہ بھی جنم لے لیتا ہے۔ (اب) اگر ایک مختار ارادہ نہ ہوتا تو کوئی اخلاقی قانون اور کسی قسم کی مسئولیت کی موجودگی

محال ہوتی (یعنی کوئی بھی کسی عمل کا جواب دہ نہ ہوتا) اور ہر اس عمل جس میں ایک مختار ارادہ شامل نہ ہو اور جس میں انسانی ارادے کا دخل نہ ہو تو وہ عمل کوئی اخلاقی حیثیت نہیں رکھتا۔ (بالفاظ دیگر) اگر مختار ارادہ نہ ہو تو اخلاق بھی نہ ہوں گے۔

ڈاکٹر مکرم: مگر ہمارے قدری اور جبری دوستوں (اسلم اور داؤد خان) کے عقائد کس بنیاد پر کھڑے ہیں؟ کیا اس معاملے پر آپ کچھ روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

اکرم: کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی پڑے گا اور میری کوشش ہوگی کہ صحیح صورت حال سامنے آ جائے۔ سو اسی سلسلے میں عرض کروں گا کہ معتزلہ حضرات واصل بن عطا کے پیرو تھے اور واصل حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ ۸۰ھ سے لے کر ۱۸۰ھ تک بقید حیات تھے جو قدری فلسفہ کے بانی تھے اس کا (واصل کا) اپنے استاد حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ سے اختلاف پیدا ہو گیا تو اپنے استاد سے جدائی اختیار کی۔ اسی لئے حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ نے فرمایا تھا کہ ہم سے عزل اختیار کی یعنی ہمیں چھوڑ کر جدائی اختیار کی۔ چنانچہ اسی وجہ سے اس کے (واصل کے) پیرو معتزلہ کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔

اسلم: سنتے ہو۔ یہ رہے ہمارے بزرگ (مشر)

داؤد: آپ کے مشر (بزرگ) ہی بے وفا تھے تو آپ سے کیا گلہ؟

اشرف: دیکھئے۔ آپ دوبارہ جھگڑنے لگے۔

ڈاکٹر مکرم: اکرم خان! آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔

اکرم: تو معتزلہ کے مقابلے میں اشاعرہ پیدا ہوئے۔ یہ لوگ (اشاعرہ) مشہور متکلم ابو الحسن علی بن اسماعیل کے پیروکار تھے اور ابو الحسن ۲۶۰ھ میں پیدا ہوا تھا اور ۳۲۴ھ میں فوت ہو گیا تھا۔ معتزلہ لوگوں کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابتداء ہی

سے انسان کو مختار پیدا فرمایا ہے (اور نیز یہ کہ) اللہ تعالیٰ انسان کے کسی کام میں مداخلت نہیں کرتا ورنہ پیغمبروں کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ ان کے مقابلے میں اشعری عقیدہ رکھنے والے کہتے ہیں کہ اگر ہم انسان کو مختار تسلیم کر لیں تو پھر خدا کی مشیت' قضاوقدر لوح محفوظ' خود علم خداوندی' قدرت اور سب کچھ باطل ٹھہر جائے گا۔ اس لئے انسان مختار فاعل نہیں بلکہ موجب فاعل ہے یعنی یہ کہ انسان ان اعمال کا کاسب ہے جو خدا نے پیدا کئے ہیں۔

مولوی احمد: گویا انسان شرعی معاملات میں اس امر کا مسئول ہے جن اعمال کا وہ کاسب ہے اور وہ خدا نے پیدا کئے ہیں۔ یعنی (اس) کسب پر اختیار رکھتا ہے۔

اکبر: اب میں آپ کو ابن سینا کے خیالات بھی بیان کروں گا وہ جبر واختیار کے مفہوم کو اس طرح بیان کرتا ہے یعنی قضا' تقدیر' مقدر اور عنایت۔ وہ کہتا ہے کہ قضا کا مفہوم عام ہے وہ خدا کی طرف سے اشیاء کی وضع کا بسیط اور پہلا عمل ہے اور تقدیر یہ ہے کہ قضا اس کی طرف تدریجی طور پر متوجہ ہے اور بسیط اشیاء۔ اور جس طرح یہ اشیاء بسیط ہیں تو خدا نے ان کو اپنے پہلے امر وفرمان سے وابستہ کی ہیں تیسرے نمبر پر قدر ہے اور یہ خدا کے فرمان کو جاری کرنے کو کہا جاتا ہے۔ جذبات اور مشخص مواد میں جو جو خاص اشخاص زیر نظر ہوتے ہیں تو ضروری ہے کہ خدا ہر چیز پر عالم ہے کیونکہ ہر چیز اپنی ذات میں عینی ہے اور یہ ضروری تھا اگر یہ ضروری نہ ہوتا تو اشیاء کا کوئی خارجی وجود نہ ہوتا اسی تعریف کی بنیاد پر خدا پہلے چیزوں کو وضع کرتا ہے۔ اور اسی کو قضا کہتے ہیں اور اس عمل میں جب خدا کا ارادہ اشیاء کو وضع کرنے کے لئے متوجہ ہوتا ہے تو ان کی فردیت اور چگونی کو مقدر کرتا ہے اور اسی کو تقدیر کہتے ہیں تو ہر موجود کا قضا میں حصہ ہے اور یہ قدر ہے اس کے

بعد ابن سینا عنایت کی تعریف یوں کرتا ہے کہ عنایت اللہ تعالیٰ کے پہلے علم کا احاطہ ہے ہر چیز پر واجب ہے کہ کلی ہو اس لئے کہ بہترین ممکن نظام کا مالک ہے۔عنایت سے ابن سینا کا مطلب علم خداوندی ہے جو ہر ایک چیز پر محیط ہے۔

ڈاکٹر مکرم: لیکن اس بیان میں جبر و اختیار کے مسئلہ کا تو کوئی تصفیہ نہ ہوا۔اس لئے کہ جب ہر چیز پہلے ہی سے خدا کے علم میں موجود ہے تو خارج میں بھی ایسی ہی ہوگی مگر اس میں اختیار کا کیا دخل ہو سکتا ہے؟

مولوی احمد: اسی پہلے (ابتدائی) علم ہی نے انسان کو اختیار عطا کیا ہے۔

اکرم: اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابن سینا بھی انسان کو نہ تو مکمل مجبور سمجھتا ہے اور نہ ہی مکمل مختار۔(دوسری طرف) ہمارے شاعر حضرات اکثر و بیشتر جبر کے قائل رہے ہیں شیخ سعدی فرماتے ہیں

قضا دگر نہ شود گر ہزار نالہ کنی

بہ شکر یا بہ شکایت برآید از دہنے

اکرم: اور یہ بھی فرماتے ہیں

فرشتہ کہ وکیل بر خزائن باد

چہ غم خورد کہ بمیرد چراغ پیرزنے

پہلے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ چاہے جتنا بھی شکر یا فریاد و شکایت کرو ئے قضائے الٰہی میں کوئی تبدیلی نہ آئے گی۔دوسرے شعر کا ترجمہ یہ ہے کہ وہ فرشتہ جو حق تعالیٰ کی ہواؤں کے خزانوں کا مالک ہے وہ اس غم سے بےفکر ہے کہ کسی بوڑھی عورت کا دیا بجھا دے۔

مولوی احمد: لیکن (یہ عقیدہ رکھنے کے باوجود) شیخ سعدی کتنے زاہد و عابد انسان تھے اور کتنی

خوبصورت کتابیں تصنیف کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی شرعی مشیت میں اختیار کے قائل تھے۔

اکرم: (اسی طرح) خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں

مرا روز ازل کارے بہ جز رندی نہ فرمودند

ہر آں قسمت کہ آنجا رفت ازاں افزوں نخواہد شد

یعنی روز اول ہی سے مجھے رند تخلیق فرمایا گیا تھا اور اسی وقت سے جو میری قسمت میں لکھا گیا تھا۔ اس سے کچھ زیادہ نہ ہوگا۔

تاہم وہ بھی حق تعالیٰ کے حضور انتہائی ادب وتسلیم کا مظاہرہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں

گناہ گرچہ نہ بود اختیار ما حافظ

تو در طریق ادب کوش و گو گناہ من ست

اور جناب عمر خیام فرماتے ہیں

بر لوح نشان بود پنھان بر دست

پیوستہ قلم زینکہ و بد فرمودست

در روز ازل بایست بداد

غم خوردن و کوشیدن مابے ہواست

اس کا مفہوم یہ ہے کہ بروز ازل خدا نے لوگوں کو جو کچھ دینا تھا دے دیا (نیک یا بد) چنانچہ خدا کی رضا پر اب ہمارا غم کھانا اور کوشش کرنا بے سود ہے۔

ڈاکٹر مکرم: تعجب ہے کہ یہ حضرات بھی۔ جبر کے بھی قائل ہیں اور اختیار کے بھی۔

داؤد: ان معزز شاعروں نے بالکل درست فرمایا ہے کہ جو کام یا چیز خدا کے علم میں پہلے

سے موجود ہو وہ ہو کر رہے گی۔

اکبر: (مگر سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ) اگر انسان مجبور ہوتا تو اس کا ہر عمل جس کام کے لئے بروئے کار لایا جاتا تو وہ کام کبھی بھی نامکمل یا ادھورہ نہ رہتا اور (چونکہ وہ علم خداوندی میں مکمل ہوتا) تو ضرور پایہ تکمیل تک پہنچتا)

داؤد: مگر کس طرح؟

اکرم: اس طرح کہ اگر اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے ایک انسان کی فطرت میں کسی ایسے فعل کا تعین کیا ہو۔ مثلاً کسی دوسرے انسان کو قتل کرنا یا ڈاکہ ڈالنا تو یہ دونوں افعال ضرور بہ ضرور صادر ہوتے۔ اس لئے کہ ان اعمال کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اسباب و ذرائع بھی مقرر (مہیا) ہوتے اور اس بات کا امکان نہیں کہ یہ اعمال صادر نہ ہوتے۔ (کیونکہ) طبعی نظام کی طرح اس میں غلطی کا امکان نہ ہوتا۔ مگر بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ (کسی شخص کے) اس قسم کے ہر دو افعال تکمیل تک نہیں پہنچ سکے ہیں (ناکام ہو گئے ہیں) تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان اعمال کا جبر کے ساتھ کوئی رشتہ یا تعلق نہ تھا بلکہ اپنے ذاتی اختیار سے کام لے کر ان اعمال کے کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ تاہم ان ہر دو افعال (قتل اور ڈاکہ) کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے (ایک شخص) اپنی دوسری کوشش سے کامیاب (بھی) ہو جاتا ہے۔

داؤد: خداوند تعالیٰ ہی اس کے لئے ذرائع برابر کر دیتا ہے۔

اکرم: داؤد خان! غلط باتیں مت کیجئے جبکہ آپ کا تو یہ دعویٰ ہے کہ حق تعالیٰ نے ازل سے ہی انسان کی سرشت تخلیق کی ہے اور (پیش آمدہ) سب کچھ اس کے اندر رکھ دیا ہے۔

ڈاکٹر مکرم: (ہنستے ہوئے) بہت خوب ........ منطقی جواب ہے یہ!

اکرم: ایک اور مثال پیش خدمت ہے ایک انسان کو راتوں رات ایک دوسرے مقام پر جانے کی ضرورت پیش آجاتی ہے رات کے اندھیرے میں آخر کار اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس نے غلط راستہ اختیار کیا ہے تو دوسری طرف چلنا شروع کردیتا ہے۔ آسمان کی طرف بھی دیکھتا ہے، ستاروں کا بھی جائزہ لیتا ہے اور منزل مقصود کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ اب (غور فرمائیے) اگر اس شخص کا یہ سفر جبر کے ماتحت ہوتا تو وہ کبھی اور کسی حال میں غلط راستے پر نہ چلتا۔ (دوسری اہم بات یہ کہ) اس کا یہ معلوم کرنا کہ وہ غلط راستے پر جارہا ہے اور اس کا دوسرا (صحیح) راستہ اختیار کرنا اور ستاروں سے رہنمائی حاصل کرنا اور اسی طرح منزل مقصود تک رسائی حاصل کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ مختار ہے۔

اشرف: بہترین دلیل ہے۔

اکرم: اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم و عقل اس لئے دیئے ہیں کہ اگر وہ طبعیت کی جبری تحریک سے غلط راستے پر چل پڑے تو ان (علم و عقل) کے ذریعے اپنی غلطی کا ازالہ کردے۔

داؤد: (فی الحقیقت) ایسے آدمی کا غلط راستہ پر چلنا اور صحیح راستہ کو دریافت کرنا (دونوں باتیں) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر تھیں۔

اکرم: داؤد خان! آپ کے دلائل میں زور نہیں رہا ابھی ابھی ایک لحظہ پہلے آپ نے فرمایا تھا۔ کہ غلط راستے پر چلتے ہوئے، خدا نے اس آدمی کو صحیح راستہ دکھادیا اور اس کے جواب میں میں نے کہا تھا کہ داؤد خان! آپ کا تو یہ عقیدہ ہے کہ سب کچھ ازل سے مقرر ہے۔

ڈاکٹر مکرم: داؤد خان! معلوم ہوتا ہے کہ (آپ کے بچپن میں) ماں باپ اور استاد نے آپ کو جو تلقین کی ہے کہ خدا موجود ہے تو آپ نے بس اسی (ابتدائی تلقین) کو کافی سمجھ لیا ہے اور آپ کو خدا کے وجود کا کوئی علم نہیں۔

داؤد: مگر ڈاکٹر صاحب! آپ کے پاس تو والدین اور استاد کی ہدایت بھی موجود نہیں اور بذات خود بھی حق تعالیٰ کے وجود کو نہیں مانتے۔ لہٰذا آپ کا نفسیات میں ڈاکٹریٹ کرنے کے باوجود میرے خیالات آپ سے بدرجہا اچھے ہیں۔

ڈاکٹر مکرم: میرے پاس حواس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں۔ چنانچہ جو چیز میرے حواس کے ادراک میں نہ آئے تو میں ایسی چیز کے وجود کو کیسے مان سکتا ہوں؟ جس کو نہ آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہو نہ کان کے ذریعے سنا جاسکتا ہو اس طرح ذائقہ اور لامسہ اسے محسوس نہ کر سکتے ہوں۔ چنانچہ ایک ایسی ذات کی تلاش اور دریافت میں اپنا قیمتی وقت اور عمر ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ اسی محسوس جہاں میں محسوس چیزوں سے استفادہ حاصل کروں۔ (خصوصاً) وہ چیزیں جو میری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں اور جنہیں میں محسوس کرتا ہوں۔

اشرف: یہ آپ دونوں نے ایک جداگانہ بحث شروع کر دی۔

مولوی احمد: تو گویا آپ کا یہ خیال ہے کہ جس چیز کو حواس خمسہ محسوس نہ کر لیں اس چیز کا وجود ہی موجود نہ ہوگا؟

ڈاکٹر مکرم: بالکل بالکل!

مولوی احمد: اچھا تو آپ کشش ثقل کے یقیناً قائل ہوں گے۔

ڈاکٹر مکرم: ہاں، کیونکہ کشش ثقل ایک حقیقت ہے۔

مولوی احمد: جی تو یہ حقیقت آپ نے کس حاسہ سے دریافت کی ہے؟ یعنی کیا آپ نے اپنی

آنکھوں سے دیکھا ہے یا کانوں سے اس کی آواز سنی ہے یا لامسہ اور ذائقہ سے معلوم کیا ہے؟

ڈاکٹر مکرم: کشش ثقل کا اثبات۔انسانی عقل نے کیا ہے۔

مولوی احمد: دیکھئے۔عقل حواس کی محتاج ہے یعنی اگر حواس عقل کو اطلاع نہ دیں تو عقل کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی۔

ڈاکٹر مکرم: نیوٹن نے جب ایک سیب درخت سے گرتے ہوئے دیکھا تو اس سے معلوم کیا۔کہ گویا سیب کو زمین نے اپنی طرف کھینچ لیا ہے گویا حاسئہ باصرہ کی قوت سے عقل نے یہ فیصلہ کر دیا۔

مولوی احمد: آپ کی قوت باصرہ تو اس بسیط کائنات کو بھی دیکھتی رہتی ہے۔طبعی نظام میں اشیاء کی مقصدیت اور غایت بھی محسوس کرتی ہوگی تو یہ فیصلہ کیوں نہیں کرتی۔کہ یہ ساری کائنات ایک عالم وتوانا ذات کی مخلوق ہے۔یہاں پر آپ کی عقل صرف نیوٹن کی بات تو تسلیم کرتی ہے کہ کشش ثقل موجود ہے لیکن یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ یہ کائنات اور طبعی نظام جو مختلف قوانین کے ماتحت قائم ہے اور ہر ایک چیز ایک خاص مقصد اور غایت بھی رکھتی ہے تو یہ سب کچھ خود بخود کیسے پیدا ہو گیا؟

ڈاکٹر مکرم: یہ سب زمانہ قدیم کے علماء کے وہ فرسودہ دلائل ہیں جن کو عصر حاضر کے دانش وروں اور سائنس دانوں نے رد کر دیا ہے۔

مولوی احمد: اچھا ہوا آپ نے سائنس کی بات بھی چھیڑ دی تو اسی سلسلے میں آپ مجھے بتا دیجئے کہ عصر حاضر کا سائنس دان مادے کے متعلق کون سا اور کیا نظریہ رکھتے ہیں؟ کیونکہ انہی سائنس دانوں نے پہلے پہل مادے کی یہ تعریف کی تھی کہ ایک ذرے کو نہ تو کوئی فنا کر سکتا ہے اور نہ ہی اسے پیدا کر سکتا ہے۔اس وقت بھی مذہبی علماء

یہ جواب دیا کرتے تھے کہ مادہ تقسیم کو قبول کرتا ہے اور جو چیز تقسیم کو قبول کرتی ہے وہ حادث ہوتی ہے۔ قدیم نہیں ہوسکتی۔ اگرچہ ہمارے پاس اتنا باریک آلہ موجود نہیں کہ مادہ کے باریک ترین ذرہ کو کاٹ سکیں۔ مگر اب جبکہ انسان ذرہ کو کاٹ لینے کے قابل ہوگیا ہے اور ذرہ کاٹ کر دکھایا بھی گیا (نتیجہ یہ نکلا) کہ مادہ نے توانائی کی شکل اختیار کر لی۔

ڈاکٹر مکرم: یہ بالکل درست ہے۔

مولوی احمد: تو کیا اس سے یہ حقیقت ثابت نہ ہوئی کہ مادہ کی اصل توانائی ہے؟

ڈاکٹر مکرم: بے شک۔ مادے کی اصل توانائی ہے۔

مولوی احمد: تو جناب ڈاکٹر صاحب! آپ اب مجھے یہ بتا دیجئے کہ (درحقیقت) توانائی یا طاقت کیا شے ہے؟

ڈاکٹر مکرم: توانائی' طاقت ہی تو ہے۔

مولوی احمد: (نہیں ڈاکٹر صاحب) توانائی ''غیر مستقل'' معنی کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بذات خود قطعی طور پر فعال نہیں ہوتی بلکہ اس سے کام لینے کے لئے ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی شے بھی اپنی وجودی حیثیت میں تبدیلی لانے کو برداشت نہیں کرسکتی تو توانائی نے مجرد حیثیت سے (ہٹ کر) جمود کی صورت کیسے اور کس قانون کے ماتحت اختیار کی؟

ڈاکٹر مکرم: مادہ میں تبدیلی اور حرکت (کی خاصیت) خود بخود پیدا ہوگئی۔

اشرف: ڈاکٹر صاحب! آپ کا جواب کمزور ہے۔

ڈاکٹر مکرم: کیا کمزوری ہے اس جواب میں؟

مولوی احمد: اس کی وضاحت میں کردوں گا یہ دیکھو ایک گول مٹول چھوٹا سا پتھر ہے مگر اس میں

کیا؟ اور اسی سے تسلسل جنم لے گا اور یہ تسلسل کبھی ختم ہونے کو نہ آئے گا۔ اگر یہ کائنات معمول ہو تو اس کی علت ضرور ہو گی۔ مگر یہاں تو علت کا تعین ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ یہ تسلسل محال ہے اور یقین کے ساتھ ایک ایسی علت ضروری ہے۔ جس کو علت اولیٰ تسلیم کیا جائے اور (پھر) اس کے لئے کوئی دوسری علت نہ ہو۔ (کیونکہ) اگر وہی علت اولیٰ نہ ہو تو کائنات بھی نہ ہو گی۔ (مگر) ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات موجود ہے۔ (لہٰذا) اس سے صاف طور پر ثابت ہو گیا کہ یہ کائنات ایک ایسی علت کی معلول ہے جس کے لئے کوئی اور (دوسری) علت نہیں۔ یہ ایک ایسی نفسیاتی دلیل ہے کہ اگر اس کو کوئی سمجھ لے تو کبھی اور کسی صورت میں اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں شک وشبہ دل میں نہ لائے گا۔

**اشرف:** واقعی یہ بڑی مفید دلیل ہے۔

**اکرم:** اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ہم علت ومعلول کے تسلسل کو مان لیں تو کائنات کی ابتداء ثابت نہیں کر سکتے۔

**اکبر:** حالانکہ کائنات کی ابتداء ایک یقینی امر ہے۔

**ڈاکٹر مکرم:** اگر آپ لوگوں کے خیال میں خدا کی کوئی ابتداء اور انتہاء نہیں ہے تو خدا کی مخلوق اور کائنات کی ابتداء بھی نہ ہو گی (کیونکہ پھر تو) کائنات بھی خدا کی طرح ہمیشہ سے موجود ہو گی۔

**مولوی احمد:** تمہاری فکر کا مزعومہ خدا (نعوذ باللہ) ہیگل کا فلسفی خدا ہے۔ جو اپنے آپ سے قطعی طور پر بے خبر ہے اور اس سے یہ سب کچھ اضطراری طور پر صادر ہو رہا ہے اور آخر کار جب وہ خدا (جس کو ہیگل کبھی فکر اور کبھی عین سے موسوم کرتا ہے) جب انسانی وجود تک پہنچ جاتا ہے تو اس مرحلے میں اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے۔

کائنات بہر حال مخلوق اور معلول ہے اور معلول یا مخلوق ۔علت کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر مکرم: لیکن جو دانشور کائنات کو قدیم مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کائنات کی مثال ایک قفل (تالے) کی طرح ہے جس میں چابی گھمانے اور کھلنے کا عمل ایک ساتھ ہوتا ہے۔(یعنی ادھر چابی گھمائی اور ادھر قفل کھل گیا)

مولوی احمد: مگر اس کے باوجود پھر بھی کائنات مخلوق ہی ثابت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر مکرم: اچھا تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علت و معلول کے مسئلہ میں علت معلول سے جدا نہیں ہوتی بلکہ ایک ساتھ یا ہمراہ ہوتی ہیں جیسے لکڑی اور میز۔دودھ اور مکھن وغیرہ اب اگر کائنات معلول اور خدا علت ہو تو کیا یہ مادی کائنات اور خدا آپس میں ایک (متحد) ہیں یا دوسرے الفاظ میں کیا کائنات عین حق ہے؟ جس طرح لکڑی اور میز ایک دوسرے کے عین ہیں۔

مولوی احمد: بڑا اچھا نکتہ اٹھایا ہے آپ نے اور کسی حد تک آپ کا خیال درست بھی ہے اور وہ اس طرح کہ بالفرض پشاور کے کسی ڈاکخانے سے کراچی تار (ٹیلی گرام) بھیجنا ہو تو تار بابو جب اپنے آلے کو دباتا ہے تو ٹک کی آواز نکلتی ہے اور وہ ٹک کی آواز پشاور سے لے کر کراچی تک تمام ڈاک خانوں میں سنی (محسوس) کی جاتی ہے۔ گویا اسی ایک ٹک نے کثرت کی شکل اختیار کی اور اس کا وجود (یا ورود) تار بابو کے وجود سے عمل میں آیا تھا۔گویا تار بابو کا وجود بھی اس میں شامل تو ہے اور علت و معلول ایک دوسرے سے جدا نہیں۔لیکن (غور کیجئے) تار بابو پھر بھی اس سے ماوراء ہے۔مقصد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کائنات کی ایک ایسی علت نہیں جیسے لکڑی اور میز اور لکڑی میز کی علت ہے اور اسی طرح (یہاں) علت و معلول ایک دوسرے

سے جدا نہیں۔ مگر حق تعالیٰ وہ علت فاعلی ہے جیسے تار بابو اپنے پیغامی لفظوں کے ساتھ موجود تو ہے مگر ان سے ماورا بھی ہے۔

**اشرف:** مولوی صاحب! بہت اچھے۔ سبحان اللہ!

**اکبر:** مولوی صاحب! آپ نے حق تعالیٰ کی تنزیہہ کی لاجواب مثال پیش کر دی۔

**ڈاکٹر مکرم:** اور وہ ھیگل والی بات آپ کو یاد ہو گی۔

**مولوی احمد:** ہاں (یاد ہے) اور وہ ھیگل کہتا ہے کہ فکر یا عین نے صرف وجود انسانی میں آ کر اپنے آپ کو پہچان لیا۔ اس سے قبل وہ اپنے آپ سے قطعی طور پر بے خبر تھا۔

**ڈاکٹر مکرم:** اس طرح تو ہیگل نے انسان کو بہت بڑے مرتبے پر فائز کیا ہے۔

**مولوی احمد:** اس میں کوئی شک نہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے۔ یہاں اپنی صورت سے مراد انسان کی صورت نہیں بلکہ (خود) خدا کی صورت ہے اگرچہ وہ بے کیف ہے۔ مگر اس کی ترجمانی کے فرائض انسان سرانجام دیتا ہے۔ (درحقیقت یہ ایک حدیث شریف کا مضمون ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ انّ اللہ خلق آدم علی صورتہ ۔

**ڈاکٹر مکرم:** وہ کیسے؟

**مولوی احمد:** دیکھئے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اپنے دو ہاتھوں کا ذکر فرمایا ہے "کہ اس

---

اور بابا یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ یہی انسان (ہر آدمی نہیں) خدا نے اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے اور یہی انسان ہی خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ نائب کو کہتے ہیں اور یہ کہ اس (خلیفہ) کو مستخلف عنہ کے اختیارات اور قوت حاصل ہوتی ہے میرا مطلب محض یہ ہے کہ قارئین کرام "مولوی احمد" کے کلمات کو کفر کے کلمات سے تعبیر نہ کریں۔ بابا نے آگے چل کر اس کا تصفیہ کیا ہے۔ مہربانی مترجم) ۔

کے دونوں ہاتھ فراخ ہیں'' اسی طرح اپنی پنڈلی کا بھی ذکر فرمایا ہے اور پنڈلی پاؤں کے بغیر نہیں ہوتی۔ مزید برآں اپنے لئے نفس کا ذکر بھی فرمایا ہے گویا انسان اللہ تعالی کی صفات کا ایک مجمل خاکہ ہے اور اسی بنیاد پر یہی انسان اللہ تعالی کی نیابت کا حقدار ہے یہی خدا کا خلیفہ ہے اسی وجہ سے مختار ہے اور اگر وہ مختار نہ ہوتا تو نیابت کے کام کو کیسے سرانجام دیتا؟

ڈاکٹر مکرم: مولوی صاحب! ہمارا عقیدہ ہے کہ یہی انسان ترقی کر کے (ارتقاء کر کے) خود قادر مطلق خدا بن جائے گا آج بھی جس انسان نے اس دنیا میں بہت زیادہ قوت اور طاقت حاصل کی ہے تو گویا وہ خدا ہے۔

اشرف: مگر ڈاکٹر صاحب![(1)] (یہ انسان) طاقت اور قوت کہاں سے حاصل کرتا ہے؟

ڈاکٹر مکرم: مادے سے اور کہاں سے؟

اکرم: (دراصل) یہ ایک اور فلسفی۔ نطشے کا خیال ہے۔ وہ کہا کرتے تھے حق۔ محض طاقت ہی ہے اور یہ کہ انسان ارتقاء حاصل کر کے خدا بن جائے گا۔

مولوی احمد: (حیرت سے) جب انسان خدا بن جائے گا تو پھر اپنی خدائی کس پر قائم رکھے گا؟

اکرم: ارتقاء کا مسئلہ ڈارون نامی فرنگی نے باقاعدہ کتابی شکل میں پیش کیا اور ساری دنیا

---

(۱) جہاں تک ارتقاء کے مسئلہ کا تعلق ہے تو یہ اعزاز مسلمان فلاسفہ اور دانشوروں کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے اس مسئلہ کو متعارف کرایا۔ ابن مسکویہ کی کتابوں میں اس نے شرح وبسط کے ساتھ اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ اخوان الصفاء کے رسائل میں بھی اس مسئلہ کو خوب خوب چھیڑا گیا ہے۔ حضرت مولانائے روم نے بھی اپنی مثنوی شریف میں ارتقاء کے سمندر کو کوزے میں بند کیا ہے۔ دوسرے مسلمان صوفیاء نے بھی عرفانی شکل میں اس مسئلہ کی تعریف کی ہے۔ علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ تاریخ میں بھی اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور یہ مترجم بے علم ہونے کے باوجود اس دعوی میں حق بجانب ہوگا کہ یورپی لکھاری مسلمان دانشوروں کی نقل کرنے کے خفیہ ماہر ہیں ہمارے علماء کی کتابیں جب یورپی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئیں۔ اس مترجم کو حاصل [illegible] ہے کہ سولہویں، سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی کے یورپی محققین کی حیثیت مسلمان دانشوروں کے [illegible] کی حیثیت [illegible] کی ہے۔

کو اس نے متاثر کیا۔ (۱)

**اکبر:** میں کہتا ہوں کہ ڈارون نے کوئی نیا مسئلہ متعارف نہیں کیا بلکہ ڈارون سے سینکڑوں برس پہلے مولانا جلال الدین رومی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنا نظریہ اپنی مثنوی میں متعارف کرایا ہے۔

**ڈاکٹر مکرم:** کیسے؟

**اکبر:** مولانائے روم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے جماد کی حالت سے ترقی پاکر نبات کی شکل اختیار کی ایک مصرعہ ہے

وز زمادی زاں بہ حیواں سرزدم

بعد ازاں فرماتے ہیں کہ حیوان سے ترقی پا کر انسان بنا اور اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ انسانی صورت سے ترقی پاکر فرشتہ اور فرشتہ سے ترقی کر کے جب میں مر جاؤں گا تو وہ چیز بن جاؤں گا جو حقیقتاً ماورائے عقل ہے اور اس وقت میں الیہ راجعون کہوں گا یعنی جہاں سے میں چلا تھا واپس اسی مقام قدسی (۱) تک پہنچ جاؤں گا۔

**مولوی احمد:** اس واپسی کا کیا مطلب؟

**اکبر:** یعنی تخلقوا باخلاق اللہ یعنی اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔

---

(۱) فی الحقیقت مسلمان فلاسفہ اور دانشور حق تعالیٰ کی برحق ہستی کو بہر لحاظ ثابت اور قائم رکھتے تھے اور یہ قرآن کی توحیدی تعلیمات کا اثر تھا۔ ارتقاء کے مسئلہ میں بھی مسلمان فلاسفہ یہی ثابت کرتے آئے ہیں کہ گیسوں سے پانی بنا بعد ازاں پانی میں پتھر اور پتھر سے مرجان۔ مرجان سے پودے اور ہوتے ہوتے آدمی معرض وجود میں آ گیا۔ اب آدمی ترقی کر کے فرشتہ اور ماوراء مخلوق بن کر انتہائے ارتقاء میں حق کی طرف رجوع پائیگا۔ الیہ راجعون کا مطلب ہی یہی ہے مگر یاد رہے کہ یورپی ذہن فطری اور پیدائشی طور پر ملحد اور بد مذہب ہونے کے علاوہ مسلمانوں کا ازلی مخالف ہے۔ چنانچہ ڈارون نے حالانکہ خدمت اپنی یورپی فطرت کے مطابق کی ہے مگر مسلمانوں کی طرح توحید کی طرف رخ نہیں کیا۔

ڈاکٹر مکرم: تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ ارتقاء کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس وقت تک جاری و ساری رہے گا جب تک انسان خدا کے وجود میں جذب نہ ہو جائے۔

مولوی احمد: یہی دراصل عقل کی کوتاہی ہے اور اسی نکتہ کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ یعنی تو اس میں جذب نہ ہونا نہ تو اس میں جذب ہو سکتا ہے بلکہ اس کو اپنے وجود میں جذب کر دے یعنی یہ کہ اس کی صفات اپنا لو۔

ڈاکٹر مکرم: لیکن ڈارون اور دیگر مفکروں کے خیال میں ارتقاء غیر مختتم ہے اور ادنیٰ مرتبہ سے اعلیٰ مرتبہ کی طرف ارتقاء کا عمل جاری رہے گا۔

مولوی احمد: یہ بات ہی خلاف عقل ہے اس لئے کہ اگر ارتقاء غیر مختتم ہو اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ حرکت جاری ہو تو کائنات ہمیشہ کے لئے نامکمل (نیمگونے) رہے گی اور یہ ایک واضح تسلسل ہو گا جو عقل کے خلاف ہے کیونکہ آخر کار یہی ارتقاء ایک نقطہ پر پہنچ کر ختم ہو گا اور میں سمجھتا ہوں کہ مادی ارتقاء جس کا تعلق اشیاء کی تکمیل سے ہے وہ ختم ہو گیا ہے اور صرف ذہنی ارتقاء جاری ہے۔

ڈاکٹر مکرم: مگر ذہنی ارتقاء بھی تو مادی ارتقاء سے پیدا ہوتا ہے۔

مولوی احمد: تو میں آپ سے یہ سوال کروں گا کہ یہ پانی جو ہم پیتے ہیں اور دیگر امور میں بھی کام میں لاتے ہیں ایک مرتقی چیز ہے یا نہیں ہے؟

ڈاکٹر مکرم: میں نہیں سمجھا آپ کا کیا مطلب ہے؟

مولوی احمد: میرا مطلب صاف ہے اور وہ یہ کہ زمانہ قبل از تاریخ سے یہ پانی...... بس پانی ہی ہے اگر یہ ارتقاء پاتا تو اس سے کوئی دوسری چیز ضرور بنتا بلکہ ہمارے سائنس دان تو کہتے ہیں کہ اگر آکسیجن اور ہائیڈروجن ایک خاص انداز سے آپس میں نہ

ملتے تو ایک ایسی چیز بن جاتی جو زہر ہوتا۔ تو ڈاکٹر صاحب ذرا غور وفکر سے کام لیں کہ پانی ہمیشہ کے لئے دو حصے آکسیجن اور ایک حصہ ہائیڈروجن کے ملاپ سے ترتیب پاتا ہے اس دنیا میں ابتداء ہی سے پانی ہی حیات (زندگی) اور صحت کا سبب ہے تو کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ایک دانا و بینا اور عالم ذات ضرور موجود ہے؟

اکرم: اچھی دلیل ہے۔

ڈاکٹر مکرم: ارے صاحب! یہ سب کچھ اتفاقاً رُو پذیر ہوا ہے مگر چونکہ ہم یہ سب کچھ مسلسل طور پر دیکھتے ہیں چنانچہ ہمارے اذہان ہی نے اس میں غایت اور مقصد مقرر کئے ہیں۔ حقیقت میں مقصدیت موجود ہے نہ غایت!

اکرم: دیکھئے آپ نے حقیقت کا نام لے لیا تو کیا آپ کے خیال میں حقیقت بھی وجود رکھتی ہے؟

ڈاکٹر مکرم: اس سے صرف آپ کا سمجھانا مقصود تھا۔

اکرم: اب آپ ہمیں یہ بھی سمجھا دیں کہ جب دو اور دو جمع کئے جاتے ہیں تو چار کیوں اور کیسے بن جاتے ہیں؟

ڈاکٹر مکرم: کیونکہ وہ ہوتے ہی چار ہیں۔

اکرم: گویا جب دو اور دو جمع کئے جاتے ہیں تو حقیقت میں چار بن جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مکرم: ہاں!

اکرم: مگر پھر بھی آپ ''حقیقت'' کو تسلیم نہیں کرتے نہ ہی اشیاء میں غایت اور مقصدیت کو مانتے ہیں۔ کیا یہ صریحاً تضاد نہیں؟

ڈاکٹر مکرم: بات یہ ہے کہ انسان نے ابتداء ہی سے دو جمع دو کو چار سمجھ لیا ہے اور اگر وہ اسے

پانچ سمجھتا ہے تو آج بھی لوگ دو جمع دو پانچ ہی سمجھتے۔

اکرم: لیکن چار کیوں سمجھنے لگے؟

ڈاکٹر اکرم: اتفاقاً بس اتفاق ہی سے چار کہہ ڈالا۔

مولوی احمد: آفرین ڈاکٹر صاحب! کافی چل چلاؤ کے بعد آپ کی تان آخر کار اتفاق پر آ کر رک جاتی ہے۔ (فرمایئے) آپ نے نفسیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے تو یہ کیوں؟ آخر کس مقصد کے لئے؟ اگر کائنات میں مقصدیت اور غایت نہ ہو اور کوئی حقیقت بھی نہ رکھتی ہو تو فرمایئے آپ کے نفسیات کے علم کا کیا فائدہ؟

ڈاکٹر مکرم: (ذرا شرمندہ ہو کر) یہ بھی اتفاق سے ہوا ہے۔ غایت اور مقصدیت کو بھی انسان نے اتفاق سے مان لیا ہے۔

اکرم: اچھا تو اتفاق کی تعریف کریں۔

ڈاکٹر مکرم: مثال کے طور پر کائنات اتفاق سے یعنی خود بخود پیدا ہوئی ہے اسی طرح کہ جب ایک ایسا کام ہو جائے جس کی کوئی علت نہ ہو تو اسے اتفاق کہیں گے۔ مثلاً کل ایک گائے ریل گاڑی کے نیچے آ گئی تھی۔ اور مر گئی تھی تو اسے وہاں تک کون لے گیا تھا۔ بس خود ہی گئی تھی۔

مولوی احمد: آپ کے اتفاق کا نظریہ۔ داؤد خان کے نظریہ کے مترادف ہے کہ جبر تو بجائے خود جبر ہے وہ اختیار کو بھی جبر کے معنوں میں سمجھتے ہیں۔ مگر آپ اتفاق کی کوئی مناسب تشریح کرنے میں بھی ناکام رہے۔ تاہم گائے کے متعلق عرض ہے کہ یہ اس کے مالک کی غفلت اور کوتاہی تھی کہ اس نے اپنی گائے کھلی (آزاد) چھوڑ دی اور چرتی چرتی وہ خوراک کی تلاش میں ریلوے لائن تک پہنچ گئی۔

ڈاکٹر مکرم: اور اتفاق سے اسی وقت گاڑی آ گئی۔

**مولوی احمد:** یہ اتفاق نہ تھا یہ گاڑی کے وہاں پہنچنے کا وقت تھا اور یہ واقعہ بھی علت و معلول کی حقیقت کا ترجمان ہے۔

**ڈاکٹر مکرم:** میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ یہ محض اتفاق ہی تھا۔

**اکرم:** مولوی صاحب! آپ جو کچھ بھی کہیں ڈاکٹر صاحب یہی ارشاد فرمائیں گے کہ مرغی کی ایک ہی ٹانگ ہے۔

**اشرف:** مرغی کی ایک ٹانگ کا کیا مطلب؟

**اکرم:** سفر کے دوران ایک امیر آدمی شب باشی کے لئے ایک سرائے میں ٹھہر گیا۔ سرائے کے مالک کو مرغی پکانے کا آرڈر دے دیا۔ مرغی پکا کر ایک ران سرائے کے مالک نے کھالی اور جب بقایا مرغی امیر کے پاس لے گیا تو اس نے پوچھا دوسری ران کہاں گئی؟ سرائے کے مالک نے جواب دیا کہ یہ ایک ٹانگ والی مرغی تھی۔ امیر یہ ماننے کو تیار نہ تھا۔ مگر ہر بار سرائے کا مالک یہی کہتا کہ حضور ایک ہی ٹانگ والی مرغی تھی۔

**مولوی احمد:** اس ضمن میں، میں نے سنا ہے کہ امیر مسافر نے ایک زندہ مرغی دیکھ لی جو ایک ہی ٹانگ پر کھڑی تھی۔ سرائے کے مالک نے انگلی اٹھا کر امیر آدمی کو کہا کہ یہ رہا ثبوت ایک ٹانگ کی مرغی کا۔ دیکھو یہ مرغی ایک ہی ٹانگ پر کھڑی ہے۔ مگر مسافر نے کہا ذرا اس کے قریب جا کر تسلی کرلوں۔ جونہی وہ مرغی کے قریب پہنچ گیا۔ مرغی اپنی دوسری ٹانگ نکال کر بھاگنے لگی اسی وقت امیر مسافر نے سرائے کے مالک سے کہا کہ جھوٹے آدمی دیکھا مرغی کی دو ٹانگیں ہوتی ہیں؟ مگر سرائے کے مالک نے جواب دیا کہ نہیں صاحب! مرغی کی ایک ہی ٹانگ ہوتی ہے البتہ ایسا ہوا کہ جونہی آپ اس کے قریب چلے گئے تو وہ کھڑی ہوگئی اور مارے خوف کے

محض اتفاق سے اس کی دوسری ٹانگ بھی پیدا ہوگئی۔ (یہ سن کر احباب ہنسنے لگے)

مولوی احمد: تو ڈاکٹر صاحب آپ کا اتفاق بھی اسی مرغی کی طرح ہے جس کی دوسری ٹانگ اتفاق سے پیدا ہوگئی تھی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ میرے خیال کے مطابق آپ ایسا کیجئے کہ دو تین دن نہ کھانا کھائیں اور نہ پانی پئیں پھر دیکھیں کہ کیا اتفاق سے آپ شکم سیر ہو جائیں گے؟

اشرف: اور میرے خیال میں اس مجلس نے طوالت اختیار کی۔ بہتر یہی ہوگا کہ آج یہی کافی سمجھ لیں۔

سب دوستوں نے اتفاق کیا اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

# چھٹی مجلس

(گزشتہ پانچ مجلسوں میں دوستوں نے جبر واختیار کے بارے میں بہت کچھ کہا اور سنا۔ مگر مسئلہ ابھی تک لاینحل تھا۔ جیسا کہ ابتداء ہی سے متنازعہ فیہ چلا آرہا ہے جونہی سارے دوست اشرف کے حجرے میں جمع ہوئے تو اشرف خان صوفی اکبر سے مخاطب ہوئے اور کہا)

اشرف: صوفی صاحب! ضمنی طور پر تو اس بحث میں آپ نے بھی کچھ نہ کچھ باتیں کی ہیں .لیکن جبر واختیار کے سلسلے میں مکمل طور پر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا ہے اس لئے آپ کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ آپ اس مسئلے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔

اکبر: اچھا تو جو کچھ میری سمجھ اور علم میں ہوگا۔ پیش خدمت کردوں گا۔ اگرچہ میرے دوست علم تصوف سے آشنا نہیں پھر بھی میری کوشش ہوگی کہ سہل ترین لفظوں میں اپنا مدعا بیان کردوں اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد اور توفیق کی التجا کرتا ہوں۔

اسلم: تصوف وسلوک کے بارے میں میں نے کسی عربی شاعر کا یہ شعر کہیں پڑھا تھا

فن التصوف ما ادق بیانہ

متحیر فیہ الامام رازی

''فن تصوف کے بیان کا کیا کہنا کہ کس قدر دقیق ہے؟ یہاں تک کہ امام رازی جیسے فاضل اجل بھی اس کی باریکیوں کو دیکھ کر حیران ہیں۔

اکرم: ہاں! اور اس شعر میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اسلم: کس واقعہ کی طرف؟

اکبر: (یہ مجھ سے سنیے) کہا جاتا ہے کہ مولانا جلال الدین رومی کی طرف سے امام فخر الدین رازی کو کسی نے کہا تھا کہ مولانائے رومی فرماتے ہیں کہ

گر بہ استدلال کار دیں بدے

فخر رازی راز دار دیں بدے

(تو مشورہ دیا گیا تھا کہ) امام فخر الدین رازی ''قال'' ''استدلال'' کے میدان سے نکل کر حال اور وجدان کی دنیا میں آ جائیں۔ چنانچہ امام رازی اپنے وقت کے ایک بہت ہی عظیم الشان صوفی ابوحمزہ خراسانی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت لینے کی درخواست کی (کہ ان عظیم صوفی سے بیعت حاصل کرلیں) بیعت ہوجانے کے بعد وہ اذکار اور اوراد شروع کئے جو حضرت ابوحمزہ خراسانی رحمتہ اللہ علیہ نے تلقین فرمائے تھے۔

داؤد: تو کیا حضرت امام رازی اپنے مقصد تک پہنچ سکے تھے؟

اکبر: (میں بتاتا ہوں) چند دن نہ گزرے ہوں گے کہ امام صاحب کو شکوک وشبہات' وسوسوں اور خوف مرگ نے متردد کردیا ان کا اپنا علم واستدلال بھی ایسا یکسر غائب ہوگیا تھا۔ کہ خود اپنے آپ کو امی اور جاہل سمجھنے لگا۔ انتہائی خوف نے آلیا سو اپنے شیخ ابوحمزہ خراسانی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس چلا گیا اور گزارش کی کہ یہ کام میرے بس سے باہر ہے۔

اکرم: (ہنستے ہوئے) ہاں! رحمان بابا نے ایسے حالات کے متعلق کہا ہے

حکه زاهد زهد کړی د يو جنت د پاره

سر سند لے نه شي په درشل د جانانه

ترجمہ: زاہد نے صرف ایک ہی جنت کے لئے اس لئے زہد کا راستہ اختیار کیا ہے
کہ وہ معشوق کی دہلیز پر سر قربان کر دینے کی ہمت نہیں رکھتا۔

اکبر: تو حضرت ابوحمزہ خراسانی نے ان سے فرمایا کہ فخر الدین ہمت سے کام لیں خوف انسانی وجود کے لئے دھنیے کی مثل ہے اور جس طرح دھنیا روئی کو دھنتا ہے بالکل اسی طرح خوف بھی انسان کی تمام صلاحیتوں کو نکھارتا ہے۔ تو امام رازی نے عرض کی کہ (پھر بھی) میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا چنانچہ حضرت شیخ ابوحمزہ خراسانی نے فرمایا بہت اچھا میرے بتائے ہوئے اوراد واشغال کو ترک کردو صرف میرے ساتھ قلبی رابطہ رکھو۔ رازی نے اس حکم پر عمل کیا اور تھوڑے دنوں کے بعد بھلایا ہوا علم واستدلال دوبارہ واپس ہو گیا اور اپنے شیخ کے ساتھ قلبی رابطہ بحال رکھا۔

اکرم: ہاں بھئی! یہ آسان کام تو نہیں۔

اکبر: کچھ عرصہ کے بعد ایک روز ابوحمزہ خراسانی رحمتہ اللہ اپنے ارادت مندوں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ کسی مسئلہ پر بات چیت ہو رہی تھی کہ حضرت اچانک خاموش ہو کر سر بہ گریبان ہو گئے۔ کافی دیر تک اسی حالت میں رہے ان کے چہرہ مبارک پر مختلف قسم کے تاثرات محسوس کئے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر فرمایا کہ

''فخر رازی مرد۔ ایمان برد''

یعنی فخر رازی فوت ہو گئے اور ایمان لے گئے (یعنی ایمان کے ساتھ فوت ہو گئے۔)

اسلم: یعنی؟

اکبر: نزع کے وقت شیطان امام فخر رازی کے پاس آیا اور وجود الٰہی کی نفی میں دلائل دینا شروع کر دیئے۔ امام کو جتنے دلائل یاد تھے شیطان کے سامنے بیان کر دیئے لیکن شیطان نے ان تمام دلائل کو رد کر دیا۔ اس وقت امام رازی پر مایوسی چھا گئی اور نعرہ مار کر اپنے مرشد کو آواز دی کہ یا مرشد مدد! یہی وہ وقت تھا جب انہوں نے اپنا سر گریبان کی طرف جھکایا تھا اور امام رازی کو توجہ دی۔ چنانچہ امام رازی نے انگشت شہادت اٹھا کر کہا کہ اے شیطان تم پر لعنت ہو' خدا کے وجود کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میرا وجدان گواہی دیتا ہے کہ خدا موجود ہے اور کلمہ شہادت اس کی زبان پر جاری ہو گیا اسی وقت شیطان دھوئیں کی طرح اڑ کر غائب ہو گیا اور امام رازی کی روح خالق حقیقی سے جا ملی۔

ڈاکٹر مکرم: (میرے خیال میں) ان بزرگوں کی کرامتوں کے سارے قصے خلاف عقل ہیں۔

اکرم: مگر ڈاکٹر صاحب! ابوحمزہ خراسانی کی یہ کرامت تو عقل کے خلاف بالکل نہیں ہے۔ آج تو ٹیلی پیتھی سائنسی طور پر بھی ثابت ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر مکرم: ہاں مگر ٹیلی پیتھی ایک جدا چیز ہے۔

اکرم: جدا چیز ہرگز نہیں۔ بس توجہ کا ایک علم ہے اور اس کا ایک ماہر سینکڑوں میل کے فاصلے پر ہو کر بھی اپنے خیالات کسی دوسرے انسان کو پہنچا سکتا ہے۔

اشرف: یقیناً آج کل سائنس دانوں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔

اکرم: میں جناب صوفی صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی بات جاری رکھیں۔

اکبر: جیسا کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو کہا تھا کہ شعور کے تین درجے ہیں یعنی فوق الشعور' تحت الشعور اور لاشعور۔ تو اسی طرح انسانی وجود بھی تین عناصر سے عبارت

ہے۔جن میں سے ایک کوملکیت یعنی فرشتوں کے خصائل، دوسرا عنصرانسانیت کہلاتا ہے اور تیسرے عنصر کوحیوانیت کہا جاتا ہے۔ان تینوں میں انسان کا اپنا اصلی عنصر انسانیت ہے۔ مابقایا ہر دو عناصر محض ترقی حاصل کرنے کے لئے عطا کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر مکرم: کیاانسان۔مرکب ہے؟

اکبر: ہاں! ان معنوں میں مرکب مگر حقیقی معنوں میں مرکب نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ملکیت اور حیوانیت۔ انسانیت سے بالکل جدا اور قطعی طور پر مختلف عناصر ہیں۔ملکیت کے طفیل انسان حق تعالیٰ سے رابطہ قائم کرسکتا ہے اور حیوانیت کے ذریعے مادی دنیا سے (بھی) تعلق رکھتا ہے۔لیکن ظاہر ہے کہ انسان جس قدر ترقی کرتا ہے اور اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے اسی قدر حیوانیت کی قید سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے اور بقول علامہ (اقبال) آخر کار ایک ایسا وقت بھی آجاتا ہے کہ انسان اپنے طبعی یعنی حیوانی عنصر کے غلبہ سے مکمل طور پر آزاد ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے مزاج میں حیوانی عنصر یعنی اس کی انا یا روح (جس کو ہم انسان کہتے ہیں) انسان کے طبعی نظام کا جزو نہیں ہے اور یہ عنصر (انا یا روح) مادی نہیں ہے جو انسانی قالب میں حصول علم کے لئے تو رکھا گیا ہے (مگر) اس کا مادی جسم تو متغیر ہوتا رہتا ہے یعنی بچہ ہوتا ہے جواں ہو جاتا ہے اور بوڑھا ہو جاتا ہے۔لیکن انسانی عنصر یعنی انا کوئی تغیر قبول نہیں کرتا۔یہی وجہ ہے کہ وہ مادیت یا حیوانیت کے عنصر پر غالب آجاتا ہے اگرچہ ایسا کرنے کے لئے اسے مجاہدہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر مکرم: وہ کیسے اور اس کی غایت اور مقصدیت کیا ہے؟

اکبر: وہ یوں کہ اگر انسان پر اس کی ملکیت کا عنصر غلبہ حاصل کرلے تو وہ مجذوب ہوجائے گا (ایسا شخص) دنیا کو ترک کر دیتا ہے ایک کونے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کہے جاتا ہے اور یہ منشائے ایزدی کے خلاف ہے۔ (کیونکہ) دنیا کو ترک کر دینا قطعی طور پر ناجائز ہے۔ کیونکہ اس مادی دنیا میں بھی خدا کی کئی حکمتیں ہیں اور ان سے محروم ہوجاتا ہے اور اگر اسی انسان پر اس کی حیوانیت کا عنصر غالب ہوجائے تو (حیوان تو چھوڑیے) درندہ بن جاتا ہے وہ (صرف) اپنے مفاد' لذت اور راحت کے لئے اسلحہ کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کرتا' وہ انسانی اخلاق حسنہ سے محروم ہوجاتا ہے اور ڈارون کے فلسفہ پر عمل شروع کر دیتا ہے گویا بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھانا شروع کر دیتی ہیں دنیا امن وامان سے محروم ہوجاتی ہے اور یہ حالت بھی منشائے خداوندی کے خلاف ہے۔ کیونکہ منشائے خداوندی تو یہ ہے کہ انسان نہ تو فرشتہ بنے اور نہ حیوان بن کر رہ جائے۔ بلکہ انسان بنے اور جب اس کی انسانیت اس کی حیوانیت اور ملکیت پر غالب ہوجائے تو (انسانیت) نکتہ اعتدال پر آجاتی ہے کیونکہ حیوانیت اور ملکیت دونوں افراط وتفریط کے[1]

---

(۱) کسی انسان کی روحانی تربیت کے سلسلے میں حمزہ باباؒ کی تحقیق یہ ہے کہ ہر انسان کے اندر تین عناصر موجود ہوتے ہیں۔ (۱) حیوانیت (۲) ملکیت اور (۳) انسانیت۔ ان میں سے حیوانیت کی تعریف یہ ہے کہ یہ نفس کا پہلا درجہ ہے۔ اس کو نفس امارہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس درجے میں ایک آدمی سے حیوانوں کی طرح افعال صادر ہوتے ہیں۔ گناہ ودل آزاری کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کا ضمیر مردہ ہوتا ہے اور جرائم اور بے راہ روی کو مقصد حیات سمجھتا ہے اور ان چیزوں پر فخر کرتا ہے جہاں تک ملکیت کا تعلق ہے تو جب ایک آدمی حیوانیت کے درجے سے ترقی حاصل کرلیتا ہے تو ملکیت کے مرتبہ پر فائز ہوجاتا ہے۔ مگر یہاں وہ صرف فرشتوں جیسے فصائل اختیار کرلیتا ہے اور اس عنصر کے اثرات سے مغلوب ہوکر ایک فرشتہ کا روپ دھار کر کسی گوشے میں بیٹھ جاتا ہے اور دنیا اور کاروبار دنیا یہاں تک کہ بال بچوں سے بھی جدا ہوکر تنہائی اختیار کرلیتا ہے۔ گویا مجذوب ہوکر دنیائی حلال کاموں سے بھی ہاتھ دھو ڈالتا ہے جبکہ انسان کا اصلی مقام فرشتوں سے بہت اوپر انسانیت کو حاصل کرنا ہوتا ہے اور جب وہ اسی مقام اصلی یعنی انسانیت کو حاصل کرلیتا ہے تو گویا خلافت اور نیابت الٰہی کا حقدار ہوجاتا ہے۔ طاہر بخاری مترجم

نقطے ہیں اور ان کو اعتدال میں رکھنے کی وجہ انسانی عنصر کا غلبہ ہے اور جب یہ عنصر غالب ہوجاتا ہے تو انسان خلافت کا حقدار ہوجاتا ہے کیونکہ (اب وہ) صحیح معنوں میں نیابت الٰہی کے فرائض کو بخوبی سرانجام دے سکتا ہے یعنی مختار ہوجاتا ہے۔

اکرم: تشکر۔اب مجاہدہ کے بارے میں بھی فرمائیں۔

اکبر: بہت اچھا تو اس سلسلے میں حضرت مولانائے روم کی بات سماعت فرمالیجئے۔ فرماتے ہیں

قال رابگزار مرد حال شو

پیش مرد کاملے پامال شو

یعنی ''ظاہری'' قیل وقال چھوڑ دیجئے حال کی دنیا کو اپنا لیجئے اور ایسا کرنے کے لئے کسی مرد کامل کا دامن تھام لیں اور ہمارے رحمان بابا فرماتے ہیں

بے رہبرہ رسیدل ویارنہ گران دی

پہ کوحہ دمہرو یا نور رہبر بویہ

بے مرشدہ حوک خبر دمریدا خلی

غوح پہ حال دفرزندانو پدر بویہ

ترجمہ: کسی رہبر کے بغیر محبوب تک رسائی حاصل نہیں ہوسکتی۔(اس لئے کہ مہ رُو محبوباؤں کی گلی تک پہنچنے کے لئے رہبر کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔(جیسے) مرشد کے بغیر کوئی اور شخص مرید کی خبر گیری نہیں کرتا۔(یوں کہ) جیسے اپنے فرزندوں کی حالت پر صرف ان کے اپنے باپ ہی کا دل پارہ پارہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اکرم: تو ایسے کامل کا پتہ کیسے اور کیونکر معلوم ہو؟ نام کے مرشد تو بے شمار ہیں۔

اکرم: ہاں، یہ تو ہے۔ مولانائے روم فرماتے ہیں

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست

پس بہ ہر دستے نہ باید داد دست

یعنی بہت سے آدمی شیطان کی شکل میں ہوتے ہیں تو سوچ سمجھ کر کسی کو ہاتھ دینا چاہئے۔

مولوی احمد: میں اکرم کو داد دیتا ہوں کہ وہ صرف فلسفے کا طالب علم نہیں بلکہ اس کا مطالعہ وسیع ہے۔

اکبر: مگر ہمارے دوسرے دوست ڈاکٹر مکرم خان جب مذہب یا مذہبی امور پر اعتراض کرتے ہیں تو اچھا نہیں کرتے۔ کیونکہ اس سے پہلے ان کے لئے ضروری ہے کہ مذہبیات کا گہرا مطالعہ کریں اور اس کے بعد اگر کوئی اعتراض کرے تو جائز ہوگا۔

ڈاکٹر مکرم: صوفی صاحب! آپ درست فرماتے ہیں اس کے بعد میں نہ صرف اسلام بلکہ دیگر مذاہب کا بھی مطالعہ کروں گا۔

اسلم: یہ بڑی اچھی بات ہوگی۔

مولوی احمد: اچھا صوفی صاحب! آپ اپنی بات جاری رکھیں تو فرمائیں۔

اکبر: تو میں عرض کر رہا تھا کہ تصوف وسلوک کا راستہ انتہائی سخت، پیچیدہ اور کئی قسم کی اونچ نیچ سے بھرا ہوا ہے اور بغیر کسی کامل استاد کے اس راستے پر چل پڑنا بے حد خطرناک ہے۔ طلب تو حق تعالیٰ کی ہوتی ہے مگر طالب حق کے لئے خود حق تعالیٰ نے یہ نوید سنائی ہے کہ والذین جاھدو فینا لنھدینھم سبلنا یعنی اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں (مجاہدہ) برداشت کرتے ہیں تو ہم ان کو اپنے راستے

ضرور دکھائیں گے۔ (سورۃ العنکبوت) آیت ۶۹

اور یہ راستہ کبھی کبھی خدا مرشد کے بغیر بھی کسی سالک کو دکھا دیتا ہے اور ایسے سالکوں کو طریقت کی اصطلاح میں اویسی کہا جاتا ہے۔ (مگر پھر بھی) حضرت اویس قرنیؓ کی روح اس کے ساتھ کام کرتی ہے۔

مولوی احمد: یہاں پر مناسب ہے کہ حضرت اویس قرنیؓ کا بھی کچھ ذکر فرمادیں۔

اکبر: ہاں! تو مشہور ہے کہ حضرت اویس قرنیؓ نے رسول ﷺ کو نہیں دیکھا تھا۔ آپؓ غائبانہ ایمان لائے تھے۔ آپؓ رسول ﷺ کے ایسے عاشق تھے کہ جس وقت (جہاد احد میں) رسول کریم ﷺ کے دندان مبارک شہید ہو گئے ہیں تو حضرت اویس قرنیؓ نے اپنے سارے دانت نکلوا دیئے اور یہ اس لئے کہ ان کو معلوم نہ تھا کہ حضرت اقدس ﷺ کے کون کون سے دانت شہید ہو گئے۔ چنانچہ اپنے سب کے سب دانت نکلوانے کا مقصد یہ تھا کہ ان میں حضورؐ کے وہ دانت بھی شامل ہو جائیں گے جو شہید ہو گئے ہیں۔

اشرف: سبحان اللہ!

اکبر: آنحضرت کبھی کبھی ارشاد فرمایا کرتے کہ **انی لاجدو نفس الرحمان من قبل الیمن** یعنی یمن کی جانب سے میں رحمان کی خوشبو محسوس کرتا ہوں اور بعد ازاں حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ کے ہاتھوں اپنا مرقع مبارک پہنچانے کی وصیت فرمائی تھی اور حضور ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا تھا کہ اویسؓ میری امت کے لئے دعا طلب کرے۔

اسلم: اللہ اکبر..... اس امت میں ایسے حضرات بھی گزرے ہیں۔

اکبر: جس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے پاس گئے

اور لوگوں سے حضرت اویسؓ کا پتہ معلوم کیا تو کسی نے بتا دیا کہ ہاں! ایک دیوانہ ایسا ضرور ہے جو وادی عرنہ میں اونٹ چراتا ہے اور لوگوں سے دور بھاگتا ہے۔ آبادی کی طرف نہیں آتا شادی اور غمی کو نہیں جانتا۔ جب لوگ ہنستے ہیں تو وہ روتا ہے اور جب روتے ہیں تو وہ ہنستا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس وادی میں چلے گئے۔ وہ اس وقت نماز میں مصروف تھے۔ جب ان کی آہٹ سنی تو نماز کوتاہ کردی۔ (۱) حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اویسؓ ہم کو رسول ﷺ نے بھیجا ہے۔ آپؐ نے اپنا یہ مرقع مبارک آپ کے لئے بھیجا ہے اور ارشاد فرمایا تھا کہ اویس میری امت کے لئے دعا مانگیں۔ حضرت اویس قرنی نے مرقع لے کر سر پر رکھا اور زار زار روئے اور پوچھا کہ خوش نصیب انسانو! آپ نے رسول ﷺ کو دیکھا تھا؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہاں دیکھا تھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اویسؓ کے اس سوال کا مطلب کچھ اور ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے رسولؐ یہ لوگ آپ کو دیکھتے تو ہیں مگر تمہارا دیدار نہیں کر سکتے تو اس کا جواب میں دوں گا کہ رسول ﷺ کو میں نے صرف ایک بار دیکھا تھا۔

مولوی احمد: نادر خیال ہے یہ!

اکبر: حضرت علیؓ نے فرمایا کہ جب مکہ فتح ہو گیا تو حضور اقدس نے میرے کندھوں پر چڑھ کر بتوں کو توڑنا چاہا مگر میرے بدن نے ناتوانی محسوس کی اور میں بے دم ہو گیا اور اسی (خاص) موقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انوار مقدسہ

(۱) دیکھو تذکرہ الاولیاء مصنفہ شیخ عطارؒ (حالات اویس قرنیؓ) یہ روایت مترجم نے ذرا مختلف بیان کی ہے یعنی شیخ عطار رضی اللہ عنہ کی تحریر کے مطابق! مگر آگے باباؒ کی تحریر کے مطابق لکھا ہے۔ انہوں نے یہ واقعہ کسی کتاب میں ایسا ہی پڑھا ہو گا جیسا انہوں نے تحریر فرمایا ہے۔ مترجم

نے مجھ پر کچھ ایسا اثر کیا جس کو میں برداشت نہیں کر سکا تو رسول علیہ السلام نے فرمایا کہ علیؓ اچھا تو تم میرے کندھوں پر چڑھ کر بتوں کو توڑ دینا۔ میں نے عرض کی کہ یا رسول علیہ السلام میں مہر نبوت پر کیسے پاؤں رکھ سکتا ہوں؟ آپؐ نے اجازت دے کر فرمایا تم اس کی فکر نہ کرنا اپنا کام کر لینا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جب میں آپؐ کے کندھوں پر کھڑا ہو گیا تو میں نے محسوس کیا کہ اس وقت گویا کائنات کا کونہ کونہ میری زد میں ہے۔ بس اسی ایک موقعہ پر میں نے رسول علیہ السلام کو (حقیقی معنوں میں) دیکھا تھا۔

مولوی احمد: سبحان اللہ!

اکبر: اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب امیر المومنین علی المرتضیٰ علیہ السلام اور معاویہ بن ابو سفیان کے درمیان صفین کے میدان میں جنگ شروع ہوئی تو دوران جنگ امیر المومنین علی المرتضیٰ علیہ السلام نے ایک ملنگ کو دیکھا جو سیدھا چلا آ رہا تھا جب ان کے قریب پہنچا تو حضرت امیر نے پہچان لیا اور ان سے کہا کہ اویسؓ یہ تم ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں یا امیر المومنین! یہ میں ہوں۔ بعد ازاں اپنے مرقع کو اٹھا کر تلوار نیام سے نکال دی اور فرمایا کہ یہی تو کچھ حاصل کرنے (کمانے) کا وقت ہے۔ میدان کارزار کی طرف بڑھے اور کئی دشمنوں کو قتل کرنے کے بعد خود شہید ہو گئے۔

اشرف: رضی اللہ عنہ

اکبر: تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بعض حضرات مرشد کے بغیر بھی اللہ تعالیٰ کی محبت میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کسی زندہ مرشد کے حوالے ضرور کئے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ بیعت کے بغیر حقیقت محمدی (علیہ السلام) تک رسائی

نہیں ہو سکتی جیسا کہ حضرت بو علی قلندر قدس سرہ کے بارے میں کہا گیا ہے۔

مولوی احمد: حضرت بو علی قلندرؒ کے متعلق کیا کہا گیا ہے؟

اکبر: حضرت بو علی قلندر مجاہدہ کے دوران دریا میں کھڑے تھے مگر سخت ترین مجاہدہ کے باوجود حقیقت محمدیہ تک رسائی نہ ہو سکی تو فریاد کرنے لگے کہ یا خدایا! یہ انوار کب مجھے نصیب ہوں گے۔ حضرت بو علی نے التجا کی کہ اے میرے مالک! مجھے تو شرم آتی ہے کہ کسی کے در پر حاضر ہو جاؤں۔ آپ اپنے فضل سے کسی کو میرے پاس بھیج دیں۔ چنانچہ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کو حکم ہوا کہ جا کر حضرت بو علی قلندر کو بیعت کر لینا۔ وہ تشریف لے گئے۔ تو حضرت بو علی رحمتہ اللہ علیہ نے دریا کے اندر سے ہاتھ دراز کر کے بیعت حاصل کر لی اور حقیقت محمدیہ کا راستہ ان پر کھلنا شروع ہو گیا۔

اشرف: اچھا۔ تو اسی لئے اس راستہ میں بیعت پہلی شرط ہے۔

اکبر: ہاں! اور پہلی سیڑھی فنا فی الشیخ ہونا ہے اور ایک سالک کے لئے از حد ضروری ہے کہ اپنا اختیار اپنے مرشد کے حوالے کر دے اور نیز اپنے مرشد کے آگے ایسا پڑا رہے جیسا مردہ تختے پر غسال کے آگے ہوتا ہے اور وہ اپنی مرضی سے کروٹ بدلاتا رہے اور سلسلہ کے (مروجہ) مجاہدہ کے بعد مرید کے اندر اپنے شیخ کے اوصاف و خصائل پیدا ہو جاتے ہیں اور مرید اس قابل ہو جاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رابطہ قائم کر سکے بعد ازاں ایک وقت ایسا بھی آ جاتا ہے کہ یہی مرید فنا فی الرسول کے مرتبہ پر فائض ہو جاتا ہے اور اب وہ اس سعادت کا اہل ہو جاتا ہے کہ وجود حق میں فنا ہو جائے (اسی کو فنا فی اللہ کہا جاتا ہے)

ڈاکٹر مکرم: بڑا مشکل کام ہے۔

مولوی احمد: اگر جذبہ صادق ہوتو کوئی مشکل کام مشکل نہیں رہتا۔

اکبر: فنا فی اللہ میں سالک کا جذبہ انتہاء تک پہنچ جاتا ہے اور اسی مرحلے پر زبان سے انا الحق کا نعرہ بلند ہو جاتا ہے۔

احمد: غالباً آپ کا اشارہ حسین ابن منصور حلاج کی طرف ہے۔

اکبر: ہاں! اس شہید صوفی کے بارے میں علماء اور اولیاء کا اختلاف چلا آ رہا ہے۔

احمد: اگر اس سلسلے میں کچھ یاد ہو تو ہمیں بھی مستفیض فرمائیں۔

اکبر: حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب تذکرہ الاولیاء میں تحریر فرمایا ہے کہ ایک روز حلاج کچھ لکھ رہا تھا ان کے مرشد حضرت سید عمرو بن عثمان مکی رحمۃ اللہ علیہ نے دریافت فرمایا کہ کیا لکھتے ہو؟ تو حلاج نے جواب دیا کہ قرآن کے جواب میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ حضرت عمرو بن عثمان رحمۃ اللہ علیہ نے جواباً فرمایا کہ خدا تمہیں ایسی موت پر مارے کہ اپنے اور بیگانے دونوں تم سے بیزار ہوں۔ اور ایک واقعہ یہ بھی بیان ہوتا ہے کہ ایک روز ان سے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ راز کو افشا کر دو گے اور سولی پر چڑھا دیئے جاؤ گے۔ حلاج نے کہا تھا کہ میرا فیصلہ آپ کا قلم کرے گا اور یہی ہوا۔ جس وقت حلاج کے قتل کا فتویٰ حضرت جنید کے سامنے لایا گیا تو حضرت جنید نے فقراء کا لباس تبدیل کر دیا اور علمائے ظاہر کا لباس پہن لیا اور تحریر فرمایا کہ ہم ظاہری شریعت کے مطابق حکم دیتے ہیں۔ جس وقت حلاج سنگسار کیا جا رہا تھا لوگ اس کی طرف پتھر پھینک رہے تھے۔ اس مجمع میں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ بھی موجود تھے اور وہ حلاج کو پھولوں سے مار رہے تھے جب پھول حلاج کو لگتا تو فریاد کرتا اور چلا کر کہتا ہے کہ شبلی! آپ تو

حقیقت سے آشنا ہیں پھر تم مجھے کیوں مار رہے ہو؟ شبلی جواب دیتے کہ شریعت کا یہی حکم ہے۔ حضرت مولانائے روم فرماتے ہیں

چوں قلم در دست غدارے بود

لاجرم منصور بردارے بود

حضرت سید شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ العزیز فرماتے ہیں کہ اگر حسین ابن منصور میرے دور میں ہوتا تو اس منزل سے گزار کر میں آگے لے جاتا اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ منصور نے تو انتہائی عاجزی کی بات کی ہے یعنی یہ کہ میں نیست ہوں اور وہی ایک انا حق اور موجود ہے مگر لوگ اس کی بات کو نہ سمجھ سکے اور اس کو قتل کر دیا۔

اکرم: دراصل انا الحق سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ میں یعنی منصور حلاج حق یا اللہ ہوں۔

اکبر: بات یہ تھی جیسے حضرت علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ ہر چیز اپنی ماہیت میں ایک انا ہے (جبکہ) حق تعالیٰ انائے اکبر ہے اور انسان انائے اصغر ہے اور (پھر) یہی انائے اصغر۔ انائے اکبر کی ایک جھلک (شعاع) ہے تو اس وقت حلاج کی انا انائے اکبر میں محو ہوگئی تھی تو گویا خود حق تعالیٰ فرما رہے تھے (کوئی اور نہیں) کہ میں حق ہوں اور حضرت مولانائے روم فرماتے ہیں کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ لانے کے لئے کوہ طور کے آس پاس میدان میں پہنچ گئے تو ایک درخت کو دیکھا جس سے انوار ظاہر ہو رہے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہی انوار کو آگ سمجھ لیا تھا اور اسی درخت (کی طرف) سے آواز آئی تھی کہ 'انّی انا اللہ'' (یعنی) میں اللہ ہوں۔ تو مولانائے روم فرماتے ہیں کہ اگر ایک درخت سے یہ سننا جائز ہو جو یہ کہے کہ میں اللہ ہوں تو اگر ایک انسان کی زبان

سے (یہ الفاظ) نکل جائیں تو اس میں کیا حرج ہے؟[1]

**اشرف:** اچھی دلیل ہے۔

**مولوی احمد:** منصور حلاج کی تو بہت سی کرامتیں بھی مشہور ہیں۔

**اکبر:** ہاں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حلاج ایک جنگل میں بہت سے دوسرے صوفیاء کے ہمراہ تھے۔ صوفیاء نے حضرت حلاج سے درخواست کی کہ اپنی کوئی کرامت دکھا دیں۔ شیخ عطار تحریر فرماتے ہیں کہ حلاج نے ان سے دریافت کیا کہ کس قسم کی کرامت چاہتے ہو؟ تو ایک صوفی نے کہا کہ بغداد کے باب الطاقہ نامی بازار کا حلوہ بہت مشہور ہے بس وہی حلوہ کھلا دیں۔ چنانچہ حلاجؒ نے ان سب سے کہا کہ ایک قطار میں بیٹھ جائیں جب وہ سب ایک قطار میں بیٹھ گئے تو حلاج اپنا ہاتھ اپنی پشت کی ظرف لے گئے اور تھالی (قاب) بھر حلوہ یکے بعد دیگرے ہر صوفی کو دے دیا اور فرمایا کہ مانگو جو مجھ سے مانگنا چاہتے ہوں میرا ہاتھ اس دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ سکتا ہے بعد ازاں انہوں نے کابل کے انگور طلب کئے۔ حلاج نے ہر ایک کے سامنے انگور کے خوشے رکھ دیئے اس کے بعد ان سے پوچھا کہ تم لوگ اس کو کرامت کہتے ہو؟ سب نے کہا کہ ہاں یہ کرامت ہی ہے۔ تو حضرت حلاج نے فرمایا کہ بخدا یہ کرامت نہیں کیونکہ حقیقت میں جس چیز کو کرامت کہتے ہیں تو اس کو ملاحظہ کرنے کی طاقت نہ تم لوگوں میں موجود ہے

---

(۱) اس وقت نہ تو مثنوی شریف میرے سامنے ہے اور نہ ہی گلشن راز جو حضرت محمود شبستری کی تصنیف ہے اسی گلشن راز میں یہ شعر درج ہے۔

روا باشد انا اللہ از درختے　　　چرا نہ بود روا از نیک بختے

یعنی اگر ایک درخت سے میں اللہ ہوں سننا جائز ہو تو ایک نیک بخت (انسان) سے سننا کیونکر جائز نہ ہوگا؟ مراد یہ کہ صاحب گلشن راز نے بھی یہی بات کہی ہے۔ مترجم

اور نہ مجھ میں۔ [1]

**ڈاکٹر مکرم:** یہ کشف و کرامات سب مداریوں کے کھیل تماشے ہیں۔ آپ لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ ایک مداری اپنے ناظرین کو ایک ٹوکری دکھاتا ہے اور یہ ٹوکری بالکل خالی ہوتی ہے اس میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مداری اس کو ایک کپڑے سے ڈھانپ لیتا ہے اور دوسرے مرحلے میں جب کپڑا ہٹا دیتا ہے تو ٹوکری سے کبوتر برآمد ہو جاتے ہیں اور اسی طرح دوسرے ٹوٹکے بھی دکھاتا ہے۔

**اکبر:** معلوم ہوتا ہے آپ کشف کو نہیں مانتے۔ تو جناب سنیں۔ کہ قبل ازیں میں نے کہا تھا کہ انسانی ذہن میں اشیاء کی صورتیں بیداری اور نیند کی حالت میں زنجیر کی کڑیوں کی طرح رواں دواں ہوتی ہیں۔ اس زنجیر کی ہر کڑی ایک صورت اور ایک شکل رکھتی ہے اور تسلسل کے ساتھ ایک کڑی کے بعد دوسری کڑی نمودار ہوتی ہے جس کا تعلق پہلی کڑی سے ہوتا ہے۔ لیکن اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کبھی کبھی ہم اپنے ایک عزیز دوست کا نام بھول جاتے ہیں۔ یاد نہیں آتا تو اس کی وجہ کیا ہے؟

**اکرم:** اس سلسلے میں مجھے ایک بات یاد آ گئی۔

**مولوی احمد:** فرمائیے۔ کون سی بات؟

**اکرم:** یہ کہ ایک دانشور نے لکھا تھا کہ کبھی کبھی ہم اپنے کسی معزز دوست کا نام بھول

---

(۱) علم تصوف کے بموجب کرامت اور معجزہ دونوں خرقِ عادت ہیں۔ مگر معجزہ پیغمبران علیہ السلام خدا کو عطا ہوتا ہے اور کرامت اولیاء اللہ کو۔ اور ان دونوں میں ایک اور فرق یہ ہے کہ کوئی پیغمبر علیہ السلام خدا جس وقت اور جہاں چاہے معجزہ دکھا سکتا ہے۔ مگر کرامت دکھانا کسی ولی کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ ہاں اگر خدا کو منظور ہو اور خدا چاہے تو کسی ولی سے کرامت کا ظہور ہو جاتا ہے کیونکہ اکثر اوقات ولی کو بھی علم نہیں ہوتا اور اس سے اچانک کوئی کرامت ظاہر ہو گئی ہے۔ مراد یہ کہ یہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ مترجم

جاتے ہیں اس کے نام کو حافظہ کے گوشوں میں تلاش کرتے ہیں مگر یاد نہیں آتا (اب) اگر وہ نام ہمارے حافظہ میں موجود تھا تو پوری شدت سے تفکر کو کام میں لانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ کہ زور لگا کر نام کو یاد کریں یعنی آہستہ سے آسانی کے ساتھ حافظہ سے لیتے (اور معاملہ ختم ہوتا) اگر بصورت دیگر وہ نام سرے سے حافظہ میں موجود ہی نہ ہوتو اس کو تلاش کرنا ہی بے مقصد بات ہوتی۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یاد سے اترا ہوا نام اچانک ہی خود بخود یاد آ جاتا ہے اور یہ انتہائی تعجب کی بات ہے۔

ڈاکٹر مکرم: یہی سوال نفسیات کی ایک عالمی یورپی خاتون نے بھی اٹھایا تھا اور اس نے اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا بھی ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ ہیلن اس گتھی کو سلجھانے میں ناکام رہی ہے۔ میں اس کی دلائل سے مطمئن نہیں ہو سکا ہوں۔

اکبر: اگر اس یورپی خاتون کو یہ علم حاصل ہوتا کہ انسانی ذہن میں اشیاء کی صورتوں کا ایک زنجیری سلسلہ ہر وقت رواں دواں ہوتا ہے تو وہ اس مسئلہ کو آسانی کے ساتھ حل کر لیتی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مثلاً کسی دن میں ڈاکٹر صاحب کا نام بھول جاتا ہوں۔ کوشش بسیار کے بعد بھی یاد نہیں آتا آخر تھک کر اس خیال کو ترک کر دیتا ہوں لیکن ایک وقت ایسا بھی آ جاتا ہے کہ میرے ذہن سے اترا ہوا ڈاکٹر صاحب کا نام مجھے خود بخود اور اچانک ہی یاد آ جاتا ہے تو دراصل اس کی ایک وجہ ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس سے قبل میرے حافظے میں دوسرے اشیاء کی صورتوں کا سلسلہ (فلم کے فیتے کی طرح) رواں دواں ہوتا ہے اور ڈاکٹر صاحب کے نام کی کڑی بہت دور ہوتی ہے اور جونہی اس کڑی کی باری آ جاتی ہے تو ذہن پر اس کا پرتو پڑ جاتا ہے (اور معاً بغیر کسی حیل و حجت کے ڈاکٹر صاحب کا نام خود بخود یاد

آجاتا ہے) مگر اس سلسلے میں ایک خاص بات کو یاد رکھنا ضروری ہے۔

ڈاکٹر مکرم: کون سی خاص بات؟

اکبر: یہ کہ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ کبھی کبھی میں ڈاکٹر صاحب کا نام بھول جاتا ہوں تو اس سے معلوم کرنا چاہئے (اور سمجھ لینا چاہئے) کہ دراصل ڈاکٹر صاحب کا نام مجھے یاد آ گیا ہے ورنہ میں اس کے نام کو یاد کرنے کی کوشش کیوں کرتا؟

ڈاکٹر مکرم: یہ نئی بات ہے۔ نادر بھی اور وضاحت طلب بھی! (ذرا اس کی وضاحت فرما دیجئے)

اکبر: عرض یہ ہے کہ دیکھئے جب میں اس کوشش میں مصروف تھا کہ مجھے ڈاکٹر صاحب کا نام یاد آجائے تو اس سے پہلے پورے یقین کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا مکمل ہیولیٰ میرے ذہن میں آ گیا تھا شخصیت کا پرتو (ہیولیٰ) عقلی اور مُجرد تھا جو عقلی حواس نے ظاہر کیا تھا اور مثالی حواس نے ڈاکٹر صاحب کی شکل و صورت تو میرے ذہن کو منتقل کر دی لیکن ان کے نام کی کڑی بہت پیچھے تھی تو لامحالہ اس کو منتقل نہ کر سکے البتہ جب اس کی اپنی باری آ گئی تو نام خود بخود یاد آ گیا۔

اشرف: مشکل ترین......نفسیاتی مسئلہ ہے۔

اکبر: ڈاکٹر صاحب! اب کشف کی حقیقت کے بارے میں سن لیجئے۔ (یاد رکھیے) کہ ہر انسان کے ذہن پر کائناتی پرتوؤں کا انعکاس ہوتا ہے مگر (چونکہ) انسان اپنے خیالات میں اس قدر مگن ہوتا ہے کہ کائناتی پرتو کو محسوس نہیں کرتا البتہ جس انسان کی مادیت (حیوانیت) مغلوب اور اس کی انسانیت غالب ہو تو وہ فوراً کائنات کے پرتوؤں کو محسوس کر لیتا ہے یعنی وہ انسان جس نے مجاہدہ کر کے اپنے انسانی

عنصر کو حیوانی اور ملکی عنصر سے آزاد کیا ہو تو وہ ہر پرتو کو محسوس کر سکتا ہے اس کے ذہن میں بھی اشیاء کا جو سلسلہ چل رہا ہوتا ہے وہ بھی اس کو معلوم ہوتا ہے مثلاً زید کوئی چیز خریدنے کے لئے بازار کی طرف چل پڑتا ہے۔ (ظاہر ہے کہ) راستہ میں وہ خریدنے والی چیزوں کے متعلق خیالات رکھتا ہوگا۔ لیکن اگر ان خیالات کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا خیال بھی اسے آ گیا جو چیزوں کے خریدنے کے خیالات سے قطعی طور پر الگ اور غیر متعلق ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ باہر سے آیا اور یہی کشف ہے۔

اشرف: بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔

اکبر: یہی وجہ ہے کہ جب صوفیاء اپنے نفس کا احتساب کرتے ہیں اور جو کوئی بھی ان کے روبرو (سامنے) آ جاتا ہے اور آنے والے کا پرتو صوفی پر پڑ جاتا ہے تو اس شخص کے خیالات (بعینہ) صوفی کے آئینہ میں منعکس ہو جاتے ہیں اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ میرا یہ خیال مختلف تھا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ خیال اسی آنے والے کا خیال تھا۔

اشرف: بے شک! ایسا ہوا ہے میرے ایک عزیز کسی بزرگ کے پاس جا رہے تھے اس نے شگون (فال) کے طور پر یہ بات ٹھان لی کہ اگر بزرگ نے مجھے شہد دے دیا تو سمجھ لوں گا کہ بزرگ صاحب ولی اللہ ہیں اور جب وہ بزرگ کے پاس پہنچ گئے تو بزرگ نے اپنے خادم سے کہا کہ اس مہمان کے لئے شہد لے آنا اور جب بزرگ سے رخصت لینے لگے تو ان سے دعا کی التجا کی۔ مگر بزرگ نے فرمایا کہ جو کچھ تم نے مانگا تھا وہ تو تمہیں مل گیا۔ مزید کی کیا ضرورت؟ اب جاؤ بحوالہ خدا!

اکبر: ہاں! ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ ایسے بزرگوں کے پاس آزمائش کے طور پر آتے

ہیں تو وہ اس سے خوش نہیں ہوتے۔ ہم پیارے ڈاکٹر صاحب! کشف ایک سائنٹفک حقیقت ہے انسان کا ہر خیال (اسکا) اپنا خیال نہیں ہوتا۔ عموماً اس پر خارجی پرتو پڑتے رہتے ہیں اور وہ (انسان) ان کو اپنے خیالات سمجھتا ہے مثلاً ایک شعر میں کہا گیا ہے

بے شماره خیالونه خدائیزده خپل دی که پردی دی

آئینه یم په بازار کنبیے نو رم حه پوختے حالونه

(اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ بے شمار خیالات (جو مجھے آتے ہیں) میرے اپنے خیالات ہیں یا کسی اور کے ہیں؟ (معلوم ہوتا ہے کہ) میں بازار میں لگا ہوا آئینہ ہوں اس کے علاوہ میرے حالات کا کیا پوچھنا؟

مولوی احمد: اچھا خیال ہے اور صوفی صاحب کے ادعا کی تصدیق بھی کرتا ہے گویا انسان کی مثال بھی بازار میں لگے ہوئے آئینہ کی سی ہے جو تمام دن لوگوں کے مختلف عکسوں سے خالی نہیں ہوتا اور ہر آنے اور جانے والے کا عکس اس پر مسلسل پڑتا رہتا ہے۔

اسلم: آپ نے بات حلاج کے معاملے سے شروع کی تھی ابھی وہ مکمل نہیں ہوئی۔

اکبر: تو جب حلاج سولی پر چڑھا دیئے گئے تو غیر معمولی جوش وخروش سے انا الحق کہنا شروع کیا۔ قاضی نے حکم صادر کیا کہ اس کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں تو حلاج نے کہا کہ تم لوگ ان ہاتھوں کو کبھی کاٹ نہیں سکتے جو محبوب کے رخ زیبا سے پردہ اٹھاتے ہوں۔ قاضی نے حکم دیا کہ اس کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں تو حلاج نے کہا تم ان ٹانگوں کو ہرگز نہیں کاٹ سکتے جو حق تعالیٰ کے مرتبہ ملکوت میں محوخرام ہوں بعد ازاں حلاج نے اپنے خون بدان سے وضو بنانا شروع کیا۔ قاضی نے

پوچھا۔ کہ یہ کیا حرکت ہے؟ تو حلاج نے جواب دیا کہ رکعتان فی العشق لا یصح وضوء هما الا بالدم یعنی عشق میں دو رکعت نماز ادا کی جاتی ہے جس کے لئے وضو اپنے خون سے بنایا جاتا ہے قاضی نے پوچھا کہ تم تو خود اپنے آپ کو حق کہتے ہو تو تم نماز کس لئے پڑھتے ہو؟ کہا میرے بغیر اور کون ہے جو میری ثنا کرے؟

اشرف: سبحان اللہ! یہ استقامت کی انتہاء ہے۔

اکبر: اسی دوران ایک درویش اس کے پاس آیا اور اس سے دریافت کیا۔ کہ عشق کیا ہوتا ہے؟ تو حلاج نے کہا کہ عشق کی حقیقت بیان کرنا تو مشکل ہے مگر آج میری حالت دیکھنا کل دیکھنا اور تیسرے دن بھی دیکھ لینا تو اس دن قتل کیا گیا دوسرے دن اس کی لاش جلادی گئی اور تیسرے دن اس کی راکھ دریائے دجلہ کے موجوں کے حوالے کی گئی راکھ کا دریا میں پڑنا تھا کہ دریا کی موجوں نے ایک سیلاب عظیم کی شکل اختیار کی اور آبادیوں کو تباہ کرنے لگے۔ چنانچہ حلاج کے ایک مرید نے آکر حلاج کی عبا دریا کی لہروں کو دکھادی اور سیلاب رک گیا۔

اشرف: معلوم ہوتا ہے کہ حسین ابن منصور حضرت امام حسین علیہ السلام کے قدم پر تھے اور اس قدر استقلال اس کو حضرت امام حسین علیہ السلام کی روح سے عطا ہوا تھا۔

ڈاکٹر مکرم: حسن ابن منصور کو حلاج کیوں کہتے ہیں؟

اکبر: وہ نسلاً دھنیا نہ تھا البتہ یہ نام ان کو ایک کرامت کی وجہ سے دیا گیا۔

ڈاکٹر مکرم: کیسی کرامت؟

اکبر: ایک بوڑھی عورت روئی لے کر دھنیے کے پاس جارہی تھی راستے میں حضرت حلاج ملے انہوں نے بوڑھی سے پوچھا۔ کہ بوڑھی اماں! کہاں جارہی ہو؟ بوڑھی

نے جواب دیا بچہ! یہ روئی دھنیا کے پاس دھننے کے لئے لے جا رہی ہوں۔ حلاج نے کہا اماں روئی کی گھڑی نیچے رکھ دو۔ بوڑھی نے ایسا ہی کیا اور حضرت حلاج نے روئی کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور روئی خود بخود دھنا شروع ہوگئی۔

ڈاکٹر مکرم: (ہنستا ہے) لوگوں نے بھی کیسے کیسے خلاف عقل قصے بنا دیئے ہیں مگر خیر! صوفی صاحب! آپ نے فرمایا تھا۔ کہ ازلی کافر بھی کفر وغیرہ سے بچ سکتا ہے ذرا اس بات پر مزید روشنی ڈالیں۔

اکبر: ہاں! میں نے یقیناً یہ عرض کی تھی مگر یہ مسئلہ نازک اور مشکل ہے اور اسے سمجھنے کے لئے بے حساب توجہ اور فکر کی ضرورت ہے۔

داؤد: مہربانی فرما کر آپ بات تو شروع کریں۔

اشرف: ہاں! اگر کسی مرحلے پر بات ہماری سمجھ سے باہر ہو تو دوبارہ معلوم کریں گے۔

اکبر: میری بھی یہ کوشش ہوگی کہ اس مسئلہ کو آسان لفظوں میں بیان کر دوں۔ تو اس مسئلے کو تصوف کی زبان میں الکل فی الکل کہا جاتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ''ہر چیز۔ ہر چیز میں!''

اسلم: واقعی مسئلہ مشکل ہے۔

اکبر: اور اس کو اضافات کا مسئلہ بھی کہا جاتا ہے مثلاً صوفیا رحمہم اللہ فرماتے ہیں التوحید اسقاط الاضافات ۔ یعنی توحید اضافات ساقط کرنے کو کہا جاتا ہے (یا اضافات ترک کرنا) تو اس ضمن میں توحید وجودی کے قائلین اور خصوصاً حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربیؒ کا عقیدہ ہے کہ ہر انسان کا رب (پروردگار) حق تعالیٰ کا ایک اسم ہوتا ہے اور وہی اسم صفت اس شخص کی فطرت ہوتی ہے۔ ہر انسان بلکہ ہر ہر چیز جو ظاہر ہوئی ہے اور یا آئندہ ظاہر ہوگی۔ ذات الٰہی کے

ساتھ ابتداء ہی سے موجود ہیں جن کو معلومات الٰہیہ یا اعیان ثابتہ کہا جاتا ہے۔
افلاطون نے بھی اعیان کے بارے میں تفصیلات دی ہیں یہاں پر ضمنی طور پر ایک بات عرض کروں گا۔ جس کی طرف حضرت علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں اشارہ کیا ہے اور وہ یہ کہ فرماتے ہیں ایک روز مشہور صوفی بزرگ حضرت بایزید بسطامی قدس سرہ کی مجلس میں ایک شخص نے ہمارے عام نکتہ نظر کے مطابق کہا کہ ''ایک وقت وہ بھی تھا کہ حق تعالیٰ اپنی وحدانیت کے ساتھ موجود تھا اور ساری کائنات اس کے علم میں تھی'' تو حضرت بایزید بسطامی نے اس سوال کا ایک ایسا جواب دیا جو بجائے خود انتہائی تعجب انگیز ہے'' یعنی حضرت بسطامی نے فرمایا ''تو اب کیا ہے اب بھی سب اس کے علم میں ہے۔''

ڈاکٹر مکرم: اس کا کیا مطلب؟

اکبر: مطلب محض یہ ہے کہ اب بھی (یہ سب کچھ) خدا کے علم میں ہے اور توحید وجودی کے مطابق بھی ساری کی ساری کائنات حق تعالیٰ کے علم میں ہے۔

ڈاکٹر مکرم: اور یہ جہاں خارجی جو ہمارے روبرو ہے؟

اکبر: (بات یہ ہے) کہ حق تعالیٰ کی ذات میں داخل یا خارج کا کوئی تصور صحیح نہیں۔ اس لئے کہ وہ محیط ہے اور حضرت علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ جو ذات محیط ہو تو کوئی بھی چیز اس کے غیر نہ ہوگی جو شے اسم باطن سے ہو کر اسم ظاہر کے سامنے آ جاتی ہے تو وہی چیز ظاہر ہوتی ہے۔ (مگر) جب یہ اشیاء یا انسان ایک دوسرے کو (اس جہان مادی میں) دیکھ لیتے ہیں تو یہ خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ گویا وہ خدا کے وجود سے الگ ایک جداگانہ وجود رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت علامہ اقبال آگے لکھتے ہیں کہ ''اے تمہارا یہ خیال ہے کہ کائنات (ایک وجود غیر کی صورت

میں) حق تعالیٰ کے مقابلے میں وجود رکھتی ہے (موجود ہے) اور اگر آپ کا یہی خیال ہو تو ایسا کرنے یا ایسا سمجھنے سے تم نے خدا کی ذات کو محدود کر دیا۔"

اشرف: تو گویا علامہ اقبال اس مسئلہ میں حضرت شیخ اکبرؒ کی تائید کرتے ہیں جبکہ کسی وقت وہ شیخ اکبرؒ اور وحدۃ الوجود کے سخت مخالف تھے۔

اکبر: بے شک۔ اپنے ابتدائی دور میں حضرت علامہ شیخ اکبرؒ کے مخالف تھے۔ مگر بعد میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وحدۃ الوجود کا نظریہ ان کو معقول نظر آنے لگا۔ چنانچہ انہوں نے گولڑہ کے پیر حضرت مہر علی شاہ رحمتہ اللہ علیہ سے اس نظریے سے متعلق کتابیں منگوائیں۔ پیر صاحب نے مطلوبہ کتابیں فراہم کیں۔ حضرت علامہ نے ان کا مطالعہ کیا اور اس مسئلے کو مکمل طور پر سمجھ لیا۔[1] چنانچہ اپنے خطبات میں وجودی توحید کے قائل نظر آتے ہیں۔

اکرم: بات اضافات کے بارے میں ہو رہی تھی۔

اکبر: ہاں بالکل۔ تو ہر انسان کا ایک رب اسم ہوتا ہے اور اسی اسم اور صفت کے مطابق اس کی شخصیت ہوتی ہے (یہاں تک) کہ اس کے ذاتی علوم بھی اس اسم اور صفت سے عبارت ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے زید کا رب اسم "رحیم" ہے اور اس کی صفت رحم ہے تو ظاہر ہے کہ رحیم۔ حق تعالیٰ کا ایک صفتی اسم ہے تو زید میں اللہ تعالیٰ رحیم کی حیثیت سے موجود ہوگا۔ مگر حق تعالیٰ تو دیگر بے شمار اسماء اور صفات کا بھی مالک ہے تو یہ (اضافی) صفات بھی زید میں موجود ہوں گے اور انہی صفات کو اضافات کہا جاتا ہے جو اسم رحیم کے ساتھ اس کے حامل میں موجود ہوں گی (یعنی زید میں) اب (غور فرمایئے) اسم رحیم تو زید کا اپنا رب اسم ہے اور

(۱) حضرت علامہؒ نے پیر صاحبؒ سے خط و کتابت بھی کی تھی۔ مترجم

(دوسرے معنوں میں) یہی اسم رحیم عین اسم اللہ بھی ہے۔ کیونکہ تمام اسماء اسم ذات میں موجود ہیں۔ چنانچہ (اسم رحیم کے علاوہ) باقی تمام اسماء اور صفات اضافات کے زمرے میں آ گئے۔

اشرف: مشکل سے سمجھ میں آنے والا مسئلہ ہے۔

اکبر: اسی طرح اگر کسی اور کا، فرض کیجئے خالد کا رب اسم کریم ہو۔ یہ بھی خدا کا نام ہے تو اس میں بھی حق تعالیٰ کے بے شمار صفات جمع ہیں اس لئے کہ کریم عین اللہ ہے۔ اور اسی کریم میں رحیم بھی موجود ہوگا۔ جو زید کا رب اسم ہے تو (معلوم ہوا) زید بھی خالد میں موجود ہوگا اور اسی کو الکل فی الکل کہتے ہیں۔

مولوی احمد: سبحان اللہ! یہ بہترین نظریہ ہے۔

اکبر: تو اب غور فرمائیے کہ توجہ کا علم (جیسا کہ ڈاکٹر صاحب بھی ٹیلی پیتھی کے قائل ہیں) کس قدر حقیقی معلوم ہوتا ہے اگر زید بکر کو توجہ دے تو بکر نہایت آسانی کے ساتھ متاثر ہوگا۔ اس لئے کہ زید پہلے ہی سے اضافی طور پر بکر کے اندر موجود ہے لہذا التوحید اسقاط الاضافات کے قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ سالک اپنے مجاہدے کے دوران یہ کوشش کرے گا کہ اسکے اپنے رب اسم کے ساتھ جو جو دیگر اسماء و صفات اضافات کی صورت میں شامل ہیں تو ان کو ساقط کرنا لازمی ہوگا تا کہ وہ ان (اضافی اسماء و صفات) کے اثر سے نکل جائے اور اسی طرح اس کا ذاتی رب اسم مجرد ہو جائے گا اور اسے توحید حاصل ہوگی۔

داؤد: یہ تو بھول بھلیاں قسم کا مسئلہ ہے۔

اسلم: کہہ دیجئے کہ یہ سب کچھ خدا خود کرتا ہے۔

اشرف: گویا اسماء اور صفات بھی ایک دوسرے کے عین ہیں۔

اکبر: اس میں کوئی شک نہیں۔ اس لئے کہ اگر ایک آدمی رحیم کی عبادت کرتا ہے تو فرمایئے کہ کیا اس نے رحمان، ستار، کریم، احد، واحد الغرض ان سب کی عبادت نہ کی؟ (اس لئے کہ یہی رحیم تو رحمان، ستار، کریم اور واحد علیٰ ھذاالقیاس کے اسماء سے بھی موسوم ہے) اور یہ بھی کہ تمام کے تمام اسماء اور صفات الٰہی اسم ذات اللہ میں مضمر ہیں اور ایک دوسرے کے عین ہیں۔

اسلم: گویا ذات حق میں عین ذات ہیں۔

اکبر: بلاشبہ عین ذات ہیں۔ (دیکھئے) سائنس کہتا ہے کہ سورج کے اندر سات رنگ موجود ہیں مگر وہ سب سورج کی روشنی میں صرف ایک ہی رنگ میں دکھائی دیتے ہیں اس لئے کہ وہ عین سورج ہیں۔ لیکن جب (سورج کی روشنی) خارج میں منعکس ہوتی ہے تو ہر رنگ کا جداگانہ وجود بھی نظر آجاتا ہے۔

ڈاکٹر مکرم: اور اب اس سوال کا جواب بھی ہو جائے جو قبل ازیں میں نے کیا تھا۔

اکبر: ہاں تو فرض...... کیجئے ایک شخص کا رب اسم مضل (یعنی گمراہ کرنے والا) ہے تو لامحالہ وہ ایک گمراہ کن فطرت رکھتا ہوگا لیکن اگر یہ شخص ایسے اضافات میں گھر گیا جن کے مربوب اسم ہادی، کریم، رحیم وغیرہ ہوں تو ان اضافات کی وجہ سے اس شخص کا اپنا رب اسم مضل معطل ہوگا اور انہی اضافات کے غلبہ کی وجہ سے اپنی فطرت کے مطابق عمل نہ کر سکے گا اسی بناء پر حضور نبی کریم ﷺ اور دنیا کے تمام دانشوروں نے فرمایا کہ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو کیونکہ نیک لوگوں کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے لوگ بھی برائی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

ڈاکٹر مکرم: ہاں! صحبت کا اثر تو ایک مانی ہوئی بات ہے لیکن اگر ایک ایسا شخص انہی نیک لوگوں کی صحبت کو ترک کر دے تو نتیجہ کیا ہوگا؟

اکبر: یہ کہ ایسا شخص اپنی فطرت کے مطابق عمل کرنے کے لئے فراغت حاصل کرلے گا اور چونکہ اس شخص کا رب اسم مضل ہوگا اور ایسا آدمی شیطان کے مؤکلوں میں شامل ہوتا ہے اور ابلیس ایسے ہی آدمیوں سے اپنا کام لیتا ہے۔

اشرف: ٹھیک ہے صوفی صاحب! اب یہ بتائیں کہ اگر میں آپ لوگوں کی صحبت اختیار کروں اور آپ سب کی فطرت مختلف خیالات کی ترجمانی کرتی ہوں تو میری نفسیاتی اور روحانی حالت کیا اور کیسے ہوگی؟

اکبر: اگر آپ نے اضافات کو ساقط کیا ہو تو ہماری صحبت کا آپ پر کچھ اثر نہ ہوگا اور اگر اضافات آپ پر غالب ہوں اور آپ کا رب اسم مغلوب ہو تو ہم میں سے آپ پر صرف اس آدمی کا اثر پڑے گا جس کا رب اسم آپ کے رب اسم سے متفق ہو۔[1]

اشرف: ہاں! یہ درست ہے۔

ڈاکٹر مکرم: مگر جبر و اختیار کا مسئلہ تو بیچ میں رہ گیا۔

اکبر: (تو سنیے) جب ایک سالک فنا فی اللہ کے مرتبہ پر فائز ہو جائے۔ یعنی اس کی فطرت اضافات پر غالب آجائے اور اس کا رب اسم مجرد ہو جائے (یا تجرد حاصل کرلے) تو اس کو فنا فی اللہ کہا جاتا ہے اور یہ ایک ایسی حالت ہوتی ہے جیسا کہ (خود) حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب میرا بندہ ایثار و قربانی کی وجہ سے میرے قریب ہو جاتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں یہاں تک کہ میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں میرے ذریعے وہ دیکھتا ہے میں اس کے کان

---

[1] مثال کے طور پر اگر اسی اشرف کا رب اسم جبار ہو اور اس کے مصاحبین میں سے کسی ایک صاحب کا رب اسم قہار ہو تو چونکہ یہ صفات ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ اس لئے اشرف پر ایسے آدمی کی صحبت کا اثر مرتب ہوگا۔ مترجم

بن جاتا ہوں سو میرے ذریعے وہ سنتا ہے میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں میرے ذریعے وہ کسی چیز کو ہاتھ لگاتا ہے گویا انائے اصغر انائے اکبر میں فانی ہو جاتی ہے یوں جیسے قطرہ دریا کا عین بن جاتا ہے تو اس مرتبہ میں ایسے شخص کا ہر عمل مکمل طور پر مختار ہو جاتا ہے حتیٰ کہ کائنات میں تصرف بھی کر سکتا ہے جیسے رحمان بابا نے فرمایا ہے

چه د روح قوت پیدا شی قمر شق که

(جب روح قوت حاصل کر لیتی ہے تو یہی روح چاند کو بھی شق کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر مکرم: رچاند کو دو ٹکڑے کرنا (شق کرنا) کس قدر عقل کے خلاف ہے؟

اکبر: وہ انسان جو حق تعالیٰ کے وجود کا قائل ہو گا وہ ایسی باتوں کی مخالفت نہیں کرتا اگر آپ بھی حق تعالیٰ کے وجود کے قائل ہوئے تو نہایت آسانی سے ایسے معجزوں پر ایمان لے آئیں گے۔

ڈاکٹر مکرم: ٹھیک ہے اگر آپ بھی کوئی ایسا ثبوت فراہم کر سکے جس کو ماننے بغیر کوئی چارہ کار نہ رہے تو کیوں تسلیم نہ کروں گا؟

اکبر: (ٹھہریے) جبر و اختیار کا مسئلہ تو چلتا رہے گا حق تعالیٰ کے وجود برحق کے متعلق بھی میں بات کروں گا مگر اس سے قبل شق القمر کے متعلق صرف ایک بات عرض کرتا ہوں۔

اشرف: ضرور۔ ضرور!

اکبر: میں نے یہ واقعہ تاریخ میں تو نہیں پڑھا ہے البتہ مولانا عبدالحمید سعدی افغانی مرحوم نے اس کا ذکر کیا تھا (مولانا مرحوم ایڈورڈز کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے ہمارے استاد، بہترین شاعر اور ایک فاضل ترین انسان تھے۔) انہوں نے

فرمایا تھا کہ ہندوستان کے ایک راجہ اپنے محل کی چھت پر بیٹھے تھے۔ راجہ صاحب بدر کامل کی روشنی میں اردگرد کے ماحول کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کہ یکا یک چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور پھر یہی دونوں ٹکڑے ایک دوسرے سے مل بھی گئے (چاند دوبارہ مکمل ہو گیا) اچھنبے کی بات تھی اور راجہ حیران رہ گیا۔ صبح کو اس نے اپنے (دانشور) وزیروں سے دریافت کیا اور فرمایا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اندریں ساعت نیک، درون ملک یا بیرون ملک کوئی ایسی بابرکت شخصیت تو پیدا نہیں ہوئی جس کی نیکی اور بزرگی کی شہرت عام ہوگی۔ تو ایک وزیر نے عرض کی کہ ہاں! ملک عرب میں ایک ایسی شخصیت پیدا ہوئی ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور قوم اس کی دشمن ہوگئی ہے۔

ڈاکٹر مکرم: اچھا تو سعدی صاحب مرحوم نے یہ کہا تھا؟

اکبر: ہاں! تو راجہ صاحب نے اپنے ایک دانش مند مشیر کی قیادت میں حضور نبی کریم ﷺ کے پاس ایک وفد بھیج دیا جب وہ مشیر جناب رسول ﷺ سے ملے تو آپ ﷺ نے مشیر کے ساتھ ہندی زبان میں بات چیت کی اور راجہ صاحب کی خیریت بھی معلوم فرمائی۔ [۱]

ڈاکٹر مکرم: یہ واقعہ میں نے کہیں بھی نہیں پڑھا ہے۔

داؤد: ڈاکٹر صاحب! اگر آپ نے یہ واقعہ پڑھا بھی ہوتا تو آپ اس سے متاثر نہ ہوتے اور جھوٹ سمجھ کر اسے رد کر دیتے۔

اشرف: رات بہت گزر چکی ہے میرے خیال میں آج اتنا ہی کافی ہے۔

---

(۱) بہت عرصہ ہوا۔ اس حقیر مترجم نے یہ واقعہ مشترکہ ہندوستان کی ایک ساحلی ریاست ٹراونکور کی تاریخ میں پڑھا تھا۔ یہ ریاست ٹراونکور کے راجہ تھے۔

سب: ٹھیک ہے۔ آج اتنا ہی کافی ہے۔

اشرف: تو۔ شب بخیر

# ساتویں مجلس

(ایک ایک کر کے سارے دوست محمد اشرف خان کے حجرے میں جمع ہوئے۔ محمد اشرف خان کا نوکر قہوہ لے آیا اور سب دوست قہوے کی چسکیاں لینے لگے اسی دوران میں محمد اشرف خان نے بات شروع کی۔)

محمد اشرف: میرا مشورہ یہ ہے کہ آج بھی صوفی اکبر صاحب اور ڈاکٹر صاحب کو موقعہ دیں گے کہ زیادہ تر وہی بولیں۔

ڈاکٹر مکرم: ہاں! ہم دونوں ضرور بات کریں گے اور میں نے اپنی استعداد کے مطابق اس کی تیاری بھی کی ہے۔

اکبر: تیاری کا مطلب تو یہ ہے کہ گویا آپ نے حق تعالیٰ کے وجود کی نفی (نعوذ باللہ) میں خاص خاص دلائل متعین کئے ہیں۔

ڈاکٹر مکرم: صوفی صاحب! میں مکمل طور پر خدا کی ہستی کا منکر نہیں۔ البتہ متشکک ضرور ہوں اور یہ شک مجھ پر اس قدر غالب ہے کہ انکار کی حد تک پہنچ گیا ہے۔

اکبر: اور میرے خیال میں اس شک کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ متشکک شخص کے لاشعور میں یقین کی چمک ضرور موجود ہوتی ہے بدیں وجہ کہ شک اس وقت پیدا ہوتا ہے کہ یقین کا مادہ دلنواز دلائل پیش کرنے سے قاصر رہے۔

اکرم: آج صوفی صاحب ایک مکمل فلسفی کے روپ میں سامنے آئے ہیں۔

ڈاکٹر مکرم: اور اس کے ساتھ ہی نفسیات کے ایک ماہر کی صورت میں بھی۔

اکبر: آپ دونوں کے اس حسن ظن رکھنے کے لئے شکر گزار ہوں اور میرا خیال ہے کہ اب اصل موضوع کی طرف رجوع کی جائے۔

ڈاکٹر مکرم: بہت اچھی بات ہے تو فرمایئے!

اکبر: ڈاکٹر صاحب! آپ فرمایئے کیا ہم ایک ایسی چیز کے وجود کا انکار یا اقرار کر سکتے ہیں جو سرے سے موجود ہی نہ ہو؟

ڈاکٹر مکرم: ذرہ اس کی وضاحت فرما دیجئے۔

اکبر: (دیکھیئے) جو چیز ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ ہم کو اس کا بھی علم نہ ہوگا اور جب علم (معلومات) نہ ہوگا تو ہمارے ذہن میں اس کے اقرار یا انکار کی کوئی گنجائش بھی نہ ہوگی (کیونکہ ہم کو اس کا علم ہی نہ ہوگا)

ڈاکٹر مکرم: (ہنستا ہے) اپنے مقصد کو ثابت کرنے کے لئے آپ نے بہترین مقدمہ کا آغاز کیا ہے۔

اشرف: کون سے مقصد کے لئے؟

ڈاکٹر مکرم: خدا کے وجود کے اثبات کے لئے۔

اکبر: (تاہم) اگر اس مقدمہ کی صحت کے بارے میں آپ کو کوئی شک ہو تو چلیئے۔ اسی سلسلے میں بات چیت کرلیں گے ہمارے یہ دوست بھی سماعت فرمالیں گے (بلکہ) میں ان سے بھی پوچھ سکتا ہوں کہ (بالفرض) ایک چیز جو قطعی طور پر موجود ہی نہ ہو تو صاف بات ہے کہ اس کے متعلق نہ تو ہم فکر کر سکتے ہیں نہ ہی اس کا انکار کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کا اقرار کر سکتے ہیں۔

اکرم: صوفی صاحب! یہ تو ایک نفسیاتی حقیقت بھی ہے۔

اسلم: کوئی شک نہیں کہ جو چیز سرے سے ہے ہی نہیں تو ہمیں اس کا علم بھی نہ ہوگا اور جب علم نہ ہوگا تو اس کے انکار یا اقرار کا سوال بھی پیدا نہ ہوگا کیونکہ انکار یا اقرار تو علم ہی کی پیداوار ہیں۔

ڈاکٹر مکرم: جناب صوفی صاحب کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے وجود کے قائل ہیں تو وہ اس وجہ سے کہ خدا کی ذات موجود ہے۔

اکبر: (مگر) جو لوگ حق تعالیٰ کے وجود کا انکار کرتے ہیں تو انکا یہ انکار بھی عین اقرار ہے۔

ڈاکٹر مکرم: (تعجب ہے) آپ انکار کو اقرار کے معنوں میں کیونکر لے سکتے ہیں؟

اکبر: (اس طرح کہ) انکار تو لازمی طور پر (کسی موجود) چیز ہی کا کیا جاتا ہے [(۱)] (لیکن) جو چیز سرے سے وجود ہی نہ رکھتا ہو تو ظاہر ہے کہ اس کا انکار بھی ناممکن اور اقرار بھی ناممکن ہوتا ہے۔

ڈاکٹر مکرم: مگر میرا کہنا تو محض یہ ہے کہ جس وہمی وجود کو تم لوگ خدا کہتے ہو وہ ہے ہی نہیں۔

اکبر: دیکھیئے ڈاکٹر صاحب! آپ نے وجود کہہ دیا آپ فکر سے کام لیں انکار یا اقرار تو کسی چیز (موجود) کا ہوتا ہے اب اگر ایک چیز موجود ہی نہ ہو تو اس کا اقرار یا انکار یقیناً بے معنی بات ہے ورنہ آپ مجھے کوئی ایسی چیز دکھا دیں جو موجود ہی نہ ہو پھر میں آپ سے اتفاق بھی کر لوں گا۔

ڈاکٹر مکرم: بالکل! میں ایسی چیز آپ کو دکھا سکتا ہوں اور سنیئے مثلاً ایک آدمی جس کی تین آنکھیں، چار ہاتھ اور تین ٹانگیں ہوں۔ فرمایئے! کبھی آپ نے ایسا آدمی دیکھا ہے؟

اکبر: (ہنستا ہے) ڈاکٹر صاحب (چونکہ) دو آنکھیں آپ نے پہلے سے دیکھی ہوئی

---

(۱) نکتہ یہ ہے کہ انکار ایک موجود چیز کا کیا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ موجود ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی شخص اس کی ذات کا انکار کر دے تو یہ بھی اقرار ہی کی ایک صورت ہے۔ جناب امیر المومنین علی کرم اللہ وجہ کا قول ہے: پاک ہے وہ ذات جس نے اس کا انکار کیا تو گویا اس کی ہستی کا اقرار کر لیا۔ مطلب یہ کہ وہ تو موجود ہے ہی اب اگر ایک شخص یہ کہہ دے کہ میں اس کو نہیں مانتا تو یہی ''اسکو'' کہنا ہی اقرار کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ یہ اشارہ خدا کے وجود کی طرف ہے۔ مترجم

ہیں تو آپ نے تین آنکھیں فرض کرلیں خود دو ہاتھ آپ کے بھی ہیں اور اس طرح اوروں کے بھی تو آپ نے چار فرض کرلیئے نیز آپ کو معلوم ہے کہ ہر آدمی کی دو ٹانگیں ہوا کرتی ہیں تو اسی (علمی واقفیت) کی بنیاد پر تین ٹانگیں فرض کرلیں۔ گویا آپ نے اپنے ذہن میں ان چیزوں کو ترتیب دے دی۔ جو (آپ کی دیکھی ہوئی اور) پہلے سے موجود تھیں تعجب یہ کہ (اس مفروضہ کو) آدمی بھی کہہ دیا پھر بھی آپ خود ہی فرمادیں کہ کیا آپ کوئی ایسی چیز سامنے لے آئے ہیں جو سرے سے موجود ہی نہیں؟ یہ تو آپ کے ذہن میں موجود چیزیں تھیں اور ہمارے ذہن میں بھی آ گئیں۔

ڈاکٹر مکرم: (دراصل) یہ تو جب زمانہ قبل از تاریخ کے انسان نے محیر العقول طاقتوں مثلاً صاعقہ (کڑک کے ساتھ زمین پر گرتے والی بجلی) طوفان، سورج، چاند اور ستاروں کو دیکھا تو اس وہم میں گرفتار ہو گئے کہ یہ سب خدا ہیں اور خوفزدہ ہو کر ان چیزوں کی عبادت شروع کردی۔

اکبر: مگر اس دلیل سے تو یہ ثابت ہو گیا کہ فطری طور پر انسان کی خمیر میں (فطرت میں) حق تعالیٰ کے وجود کا احساس موجود ہے ورنہ کیونکر ان مختلف اشیاء کو خدا کہتے یا ان کی عبادت کرتے؟ اور یہ نظریہ وہمی بھی نہیں بلکہ علمی ہے کیونکہ انسان تو ابتداء ہی سے خدا کے وجود کا فطری احساس رکھتا ہے لیکن وہ حق تعالیٰ کے صفات اور افعال کی کیفیت سے آشنا نہ تھا۔ بس آہستہ آہستہ ذہنی ترقی کرتا رہا اور حق تعالیٰ کے وجود کے تصور میں بھی ترقی ہوتی رہی۔ لیکن توحید خالص پیش کرنے کا

اعزاز صرف دین اسلام ہی کو حاصل ہو گیا۔ (۱)

ڈاکٹر مکرم: اصل میں خدا کے وجود کا تصور انسان کو اس کے آبا وٗ اجداد کی طرف سے میراث کے طور پر منتقل ہوا ہے۔

اکبر: (مگر سوال یہ ہے) کہ انسان کے آبا وٗ اجداد خدا کو کیوں مانتے تھے؟

ڈاکٹر مکرم: ان کو (یہ خیال) اپنے آبا وٗ اجداد سے منتقل ہوا ہوگا۔

اشرف: یہ تو وہی تسلسل والی بات دوبارہ شروع ہو گئی۔ جس پر اس سے قبل بھی بحث ہو چکی ہے۔

اکبر: اچھا ڈاکٹر صاحب آپ بتا دیجئے کہ یہ تسلسل کہاں پر جا کر ختم ہوگا۔

اسلم: بابا آدم تک اور کہاں تک۔

ڈاکٹر مکرم: بابا آدم کا قصہ فرضی ہے۔ مخلوقات ابتدائی طور پر کیڑوں کی شکل میں پیدا ہوئی تھی اور بعد میں ترقی کرتی رہی۔

اکبر: اچھا۔ میں (کسی حد تک) آپ سے متفق ہوں کیونکہ مولانائے روم رحمتہ اللہ علیہ

---

(۱) یہ بالکل صحیح اور درست ہے۔ اگر آپ تقابلی طور پر دنیا بھر کے مذاہب کو لے لیں تو کسی مذہب میں بھی خالص توحید موجود نہیں۔ مثلاً حضرت زردشت کے مذہب میں مکمل دوئی ہے۔ وہ خیر کے خالق کو یزدان اور شر کے خالق کو اہرمن کہتے ہیں۔ جناب گوتم بدھ کی طرح حضرت زردشت نے بھی شادی کے بعد دنیا ترک کی تھی۔ جناب گوتم کسی ایشور یا پرم آتما یعنی خدا یا آتما (روح) کا قائل نہیں یا اس کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ عیسائیت میں تثلیث کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ وہ ''ایک تین میں اور تین ایک میں'' پر ایمان لاتے ہیں۔ یہودیت میں یہودیوں نے حضرت عزیز علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا تھا۔ ہندو دھرم میں (شنکر اچاریہ کے علاوہ) حکماء کی اکثریت نے ذات واحد الوجود کو تین افراد تک محدود کر دیا ہے یعنی پرم آتما' جیو آتما اور پرکرتی۔ یہ بھی ایک قسم کی تثلیث ہے۔ ان میں سے جو ہندو حکماء خدا کی ذات کے قائل بھی ہیں تو وہ حلول واتحاد کے قائل ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو حلول واتحاد کے لئے بھی دو اشخاص کی ضرورت ہو گی تا کہ ایک دوسرے کے اندر گھس کر اس میں شامل ہو جائے۔ یہ بحث لمبی ہے۔ مختصر یہ کہ صرف اسلام ہی وہ دین واحد ہے جس نے یہ تعلیم دی کہ کہہ دے وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ اور نہیں ہے اس کا ایک بھی کفو (ذات برادری والا) طاہر بخاری مترجم

نے اپنی مثنوی میں ارتقاء کی بات کی ہے اور جس کا کچھ نہ کچھ ذکر گزشتہ ایک بحث میں بھی ہو چکا ہے یہ نظریہ انہوں نے ڈارون سے بھی بہت پہلے پیش کیا تھا چلیئے میں مان لیتا ہوں کہ ابتداء میں مٹی اور پانی کے امتزاج سے کیڑے پیدا ہو گئے۔

ڈاکٹر مکرم: اور پھر کیڑوں نے ارتقاء حاصل کی۔

اکبر: خوب! تو اب یہ بھی بتا دیجئے کہ کیڑوں میں وجود حق تعالیٰ کا احساس موجود تھا؟ جو ان کی آئندہ نسلوں کو منتقل ہوتا رہا کیونکہ بقول ڈاکٹر صاحب یہی کیڑے ہی انسان کے آباؤ اجداد ہوں گے۔ اگر جواب اثبات میں ہو تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ابتداء ہی میں ان کو اپنی ہستی (وجود) کا احساس عطا فرمایا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کیڑوں کے ماقبل ایسی کوئی چیز نہ تھی جس کو ہم ان کا مورث سمجھ لیں۔ اور وجود الٰہی کا احساس ان کی خمیر میں ان کے آباؤ اجداد کی طرف سے بطور وراثت سمجھ لیں لیکن اگر جواب نفی میں ہو یعنی یہ کہ حق تعالیٰ کے وجود کا احساس ان کیڑوں میں ابتداء ہی سے موجود نہ تھا تو (سوال یہ ہے کہ) یہ احساس بعد میں کیسے پیدا ہو گیا؟ ظاہر ہے کہ جوں جوں وہ ترقی کرتے رہے تو ان کے علم میں بھی اضافہ ہوتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے وجود کا احساس بھی نکھرتا گیا اور یہی احساس نسل انسانی کو منتقل ہوتا رہا اور معاً وجود حق اور اس کی معرفت کے سلسلے میں بھی ترقی ہوتی رہی۔

ڈاکٹر مکرم: (مگر) آپ کا مذہب تو کہتا ہے کہ خدا نے سب سے پہلے حضرت آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور پھر اس میں روح ڈال دی تو کیا عقل سلیم یہ بات تسلیم کر سکتی ہے؟

اکبر: دیکھئے ڈاکٹر صاحب! میں نے تو آپ سے متفق ہو کر آپ کا نظریہ ارتقاء مان لیا ہے (یعنی) جس نظریہ کے آپ قائل ہیں تو اسی نظریہ کی روشنی میں بات کر رہا

ہوں۔(ہاں) قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور اس کی اولاد کو نطفے سے۔تو یہاں پر یہ انکشاف ہو گیا کہ یہی انسان ایک ایسے مرحلے سے بھی ہو کر گزرا ہے کہ نطفہ نہیں رکھتا تھا۔بعد میں ایک نسل کی حیثیت سے نطفے کا مالک بن گیا۔تو اس حقیقت کی روشنی میں صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ ڈارون کا یہ خیال سراسر غلط ہے کہ نسل انسانی کے اصل مورث بندر یا گوریلے ہیں۔

اشرف: (غالبًا) ڈارون نے اپنے عزیز و اقارب کی شکلوں کو دیکھ کر ہی یہ خیال قائم کیا ہوگا (سب ہنستے ہیں)

اکبر: اس سے معلوم ہو گیا ہے کہ اگر ہم یہ بات تسلیم کر لیں کہ زندگی کی ابتداء کیڑوں سے ہوئی ہے تو کیڑے کی صورت میں بھی انسان' انسان ہی تھا۔اور دیگر حیوانات مثلاً اونٹ' ہاتھی' گدھا' چیتا اور شیر وغیرہ اسی ہیئت کذائی میں موجود تھے جو ہیئت و شکل وہ آج رکھتے ہیں اور موجودہ شکل ہی کی صورت میں ترقی کی ہے۔(مراد یہ کہ) ہر کیڑے میں اس کی اپنی انفرادیت موجود تھی اور اپنی انفرادیت ہی میں ارتقاء کی ہے (یعنی انسان اول بھی انسان تھا اور آخر بھی اسی طرح گھوڑا یا گدھا ابتداء میں بھی گھوڑا یا گدھا تھا اور اب بھی ہے ہاں مگر اپنی انفرادیت میں ترقی کرتے رہے)

ڈاکٹر مکرم: آپ کی بات وزن دار معلوم ہوتی ہے۔

اکبر: تشکر!

ڈاکٹر مکرم: میں آپ کے شکریہ کا شکر گزار ہوں۔مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں آپ کے دلائل کا قائل یا قانع ہو گیا ہوں میں نے تو صرف آپ کے حسن بیان کی

تعریف کی ہے۔

اکبر: میں بذات خود بھی یہ ضروری نہیں سمجھتا کہ کوئی (مخاطب) میری بات کا قائل ہو جائے۔ میں تو اپنی استعداد اور سمجھ بوجھ کے مطابق اپنا فرض ادا کرتے ہوئے اپنے مقصد کا اظہار کرتا ہوں۔

ڈاکٹر مکرم: اچھا یہ بتائیں کہ اگر ہم یہ بات تسلیم کرلیں کہ خدا موجود ہے اور وہ محیط بھی ہے تو لازم ہوگا کہ اس کائنات کی ایک ابتداء بھی ہو اور وہ ابتداء خدا کی طرف سے ہوئی ہو۔

اکبر: (یاد رکھیے) ہر حادث (فنا ہونے والی چیز) یقیناً ایک ابتداء رکھتی ہے اس طرح کہ پہلے آ موجود ہوتی ہے اور (آخرکار) فنا ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر مکرم: مگر (سوال یہ ہے کہ) جب خدا کے بغیر اور کوئی چیز موجود نہ تھی تو اس کائنات کو کس چیز سے پیدا کیا (جبکہ) ہر معلول کے لئے ایک علت کے تو آپ خود بھی قائل ہیں۔

مولوی احمد: ڈاکٹر صاحب اللہ تعالیٰ علت العلل ہے اس کے لئے عدم سے ایک چیز کو تخلیق فرمانا کوئی مشکل نہیں۔

ڈاکٹر مکرم: اس بات سے میری تسلی نہیں ہوتی (کیونکہ) آپ کے دلیل سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے وجود کے بالمقابل ''عدم'' بھی موجود تھا جس سے کائنات پیدا کی گئی اور اگر اس (ناممکن) بات کو ہم تسلیم کرلیں پھر تو لامحالہ عدم بھی ایک (الگ) وجود ثابت ہوگا جبکہ عدم کے معنی ناپیدی' نہ ہونے اور نیستی کے ہیں تو ناپیدی سے ہستی کیسے پیدا ہوگئی؟

اکبر: ڈاکٹر صاحب کا خیال بالکل بجا اور صحیح ہے۔ جناب مولوی صاحب! جن علماء نے

یہ کہا تھا کہ خدا علت العلل ہے اور علت العلل کے لئے کوئی مشکل نہیں کہ عدم سے کوئی چیز پیدا کرلے تو (سچی بات یہ ہے کہ) ان کے پاس کوئی معقول دلیل نہ تھی اور یوں انہوں نے عدم کو بھی ایک وجود ثابت کرلیا۔

اکرم: واقعتاً علماء کی یہ دلیل خلاف عقل ہے۔

اکبر: مگر جس طرح وجودی صوفیاء نے اس کا جواب دیا میرے خیال میں شاید وہ آپ کی نظر سے نہ گزرا ہوگا۔

اکرم: مہربانی فرما کر ہمیں اس سے ضرور مستفید فرمائیں۔

اکبر: (اور تو اور) حضرت علامہ اقبال نے بھی صوفیاء سے یہ دلیل اخذ فرمائی ہے اور اسے اپنے خطبات میں بیان بھی کیا ہے اور جیسے کہ میں نے کہا تھا کہ حق تعالیٰ کا علم عین ذات ہے۔ اس کے علم میں بے شمار معلومات ہیں۔ دراصل علم اس صفت ہی کو کہا جاتا ہے جس میں معلومات ہوں ورنہ وہ علم نہ بلکہ جہل یا جہالت ہوگی اس مرتبہ میں معلومات الٰہی کو اعیان ثابتہ بھی کہتے ہیں جس وقت حق تعالیٰ ارادہ فرمائے (کہ کسی چیز کو پیدا کرے) تو اسی معلوم کو اسم باطن سے اسم ظاہر کی طرف لے آتے ہیں اور جب وہ اسم ظاہر کے روبرو (آمنے سامنے) ہو جاتی ہے تو اس سے جہان خارجی کا تصور پیدا ہو جاتا ہے۔ (گویا) یہ کائنات اللہ تعالیٰ کے علم اور علمی صورتوں کا اظہار ہے علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی فکری وخیالی تخلیق کے (باوصف) تخلیقی فعالیت کا اظہار ہے۔

مولوی احمد: اس بات کی مزید تشریح کریں یہ تشریح طلب ہے۔

اکبر: ہم اپنے ذہن اور فکر میں ایک باغ بناتے ہیں اس باغ میں انواع واقسام کے پودے لگاتے ہیں اس میں پھولدار اور میوہ دار پودے اور درخت بھی لگاتے ہیں

اس باغ کی نگہداشت کے لئے مالی بھی مقرر کرتے ہیں۔ نیز اسی باغ میں چلنے پھرنے کے لئے روشوں کا اہتمام بھی کرتے ہیں اور یہ سب چیزیں اب بھی علم خداوندی میں موجود ہیں۔

مولوی احمد: شیخ احمد سرہندیؒ (جن کو مجدد الف ثانی بھی کہتے ہیں) نے لکھا ہے کہ کائنات اللہ تعالیٰ کی صفات کا سایہ (ظل) ہے۔

اکبر: مگر یہاں پر حضرت مجدد الف ثانی ایک غلطی کا شکار ہو گئے (آپ غور فرمائیے) صفات بذات خود غیر فعال ہیں اور یہ کائنات صفات الٰہی کی مظہر نہیں بلکہ بجائے خود حق تعالیٰ کی صفات کا اجتماع ہے (آپ کو علم ہوگا) کہ صفات بغیر ذات کے قائم ہی نہیں رہ سکتے۔ تو (اسی لئے) خارج میں صرف حق تعالیٰ ہی موجود ہے۔ (دوسری اہم بات یہ ہے کہ) صفات بذات خود سائے یا ظل کی حیثیت رکھتے ہیں تو سائے کا سایہ تو قطعی طور پر ناممکن ہے۔

اشرف: بات عجیب ہے۔

اکبر: یہ آپ نے ہاتھ میں کیا چیز اٹھالی ہے؟

ڈاکٹر مکرم: یہ ایک چھوٹا سا پتھر ہے۔

اکبر: تو چلیئے آپ کی اس کی تعریف کیجئے کہ پتھر کہتے کس چیز کو ہیں۔

ڈاکٹر مکرم: یعنی جس چیز میں سختی، گولائی، خاکی رنگ اور وزن موجود ہو اس کو پتھر کہتے ہیں۔

اکبر: تو ڈاکٹر بھائی! سختی، گولائی، خاکی رنگ اور وزن۔ یہ سب صفات ہی تو ہیں اور جب یہ صفات مجتمع ہو گئے تو پتھر کی صورت میں ظاہر ہو گئے اور اگر یہ صفات منتشر ہو گئے تو پتھر کا وجود بھی ختم ہو جائے گا یعنی وہ وجود جس کو ہم دیکھتے ہیں۔

مولوی احمد: مگر ڈارون کے ارتقاء پر بحث ابھی تک نامکمل ہے۔

ڈاکٹر مکرم: اس سلسلے میں دو طرح کے خیالات کا اظہار ہوا ہے ایک گروہ کا خیال ہے کہ کائنات کی ہر چیز میں ایک مقصد اور غایت پوشیدہ ہے جبکہ دوسرے گروہ کا خیال یہ ہے کہ کائنات کے ساتھ انسان کا تعلق بس مشین کی طرح ہے کہ جس کو اپنی بھی خبر نہیں اور اشیائے کائنات کا کوئی مقصد نہیں۔ جس طرح کائنات اتفاقی طور پر پیدا ہو گئی ہے اس طرح یہ تمام اشیاء بھی بے مقصد پیدا ہوئی ہیں۔

اکرم: مگر اس سلسلے میں آپ کا اپنا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر مکرم: میرا خیال بھی یہی ہے کہ کائنات کا کوئی مقصد یا غایت نہیں ہے۔

اکبر: اور یہ اس لئے کہ آپ ایک ازلی اور ابدی خالق کے وجود کو نہیں مانتے۔

ڈاکٹر مکرم: صوفی صاحب! ہم دیکھتے ہیں اور ہمارا مشاہدہ ہے کہ بہت سے کیڑے مکوڑے وغیرہ پیدا ہوتے ہیں اور فنا ہو جاتے ہیں فرمایئے وہ کس مقصد اور غایت کی ترجمانی کرتے ہیں؟

اکرم: تعجب تو یہ ہے کہ آپ پھر بھی ارتقاء کے قائل ہیں اور ارتقاء کا مطلب یہ ہے کہ ادنیٰ مرتبے سے اعلیٰ مرتبے تک پہنچا جائے تو اس لحاظ سے مقصدیت اور غایت کس طرح متصور نہ ہوں گے؟

ڈاکٹر مکرم: جب انسان مسلسل ان چیزوں کو دیکھتا ہے تو اسی بناء پر ان سے غایت بھی منسوب کر دی (یعنی) اشیاء کے ساتھ انسان کے مسلسل اور متواتر تعلق نے اس خیال کو جنم دیا ہے۔

اکرم: ڈاکٹر صاحب! ارتقاء کا مقصد یہ ہے کہ ہر چیز اس سمت میں چل پڑے کہ ارتقاء کے مقصد کو پورا کر سکے۔ اب اگر یہی ارتقاء بے مقصد ہو اور یہ سارا کارخانہ اپنے آپ خود چل رہا ہو (تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے) کہ اس کی حرکت صحیح جانب کی

طرف کیوں ہے؟ کیونکہ بصورت دیگر (خود بخود چلنے کی صورت میں) تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اس کی حرکت صحیح سمت کی طرف ہوتی (لہذا) اپنے مقصد اور ہدف کی سمت چلنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک دانا و بینا ذات کی مشیت کے مطابق چل رہا ہے۔

اکبر: بہت خوب اکرم خان، بہت اچھے!

ڈاکٹر مکرم: کسی صوفی کے ساتھ جب ایک فلسفی بھی مل جاتا ہے تو حالت یہ ہو جاتی ہے جو کہا گیا ہے کہ ہرنی تو ویسے بھی بڑی تیز رفتار تھی اس کے اوپر جب اسے گھنگرو بھی ڈالے گئے (تو تیز رفتاری میں مزید اضافہ ہو گیا)[1]

سب ہنستے ہیں۔

اکبر: دیکھئے ڈاکٹر صاحب! پال کا کہنا ہے کہ یہ انتہائی نامعقول بات ہے کہ ایک طرف تو یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ حیات (زندگی) ایک خاص سمت کو حرکت پذیر ہے اور یہ اس لئے کہ حیات (زندگی) صحیح و سالم اور باقی رہ سکے اور آگے نکل جائے اور دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حیات (زندگی) کا کوئی مقصد یا غایت نہیں ہے لیکن اگر مقصد اور غایت نہ ہو تو جدوجہد اور دوڑ دھوپ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ایک اور دانشور ھکسلی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ میکانکی (مشین) فکر کی نئی کامیابی یعنی ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے انسان کو یہ باور دلایا ہے کہ انسان سے باہر ایک ایسی قوت موجود ہے جو اس سلسلے کائنات کو خیر کی طرف لے جا رہا ہے (یعنی بھلائی کی طرف) لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہی ہکسلی اس کے بعد یہ بھی کہتا ہے کہ ارتقاء کی یہ قوت بالکل اندھی ہے اب

---

(۱) یہ ایک پشتو ضرب المثل ہے۔ اس کے مقابلے میں اردو کا ضرب المثل معلوم نہ ہو سکا۔ (مترجم)

اگر یہ قوت ہم کو خیر اور بھلائی کی طرف لے جا رہی ہو تو اسی قوت کو بالکل اندھی کہنا بے معنی بات ہوگی اس طرح اگر ایک زندہ وجود اپنی بقاء اور ارتقاء کے لئے دوڑ دھوپ اور جدوجہد کرتا ہو تو اس وجود کو بھی کسی صورت میں مشینی کہنا جائز نہ ہوگا۔[۱]

اکرم: اور آپ کو معلوم ہے کہ ڈارون نے ارتقاء کا نظریہ پیش کرنے کے بعد کیا کہا تھا؟

ڈاکٹر مکرم: اس نے کیا کہا تھا؟

اکرم: اس نے کہا تھا بلکہ تحریر کیا تھا کہ ارتقاء کا جو نظریہ میں نے پیش کیا ہے اور اس میں کسی خالق حقیقی کے وجود سے انکار کیا ہے تو یہ اس لئے کہ جو کچھ میں نے ظاہر میں محسوس کیا وہی تحریر میں لے آیا۔

مولوی احمد: گویا (آخر کار) اپنی غلطی کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔

اکبر: (یاد رکھیے) کوئی بھی دانشمند انسان (ساری عمر) اپنی غلطی پر قائم نہیں رہ سکتا۔

مولوی احمد: یہ بھی کسی بڑی شخصیت کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم کر لے۔

اکبر: (درحقیقت) انسان کی شخصیت اور اس کا وجود اللہ تعالیٰ کے علم اور حکمت کا ایک ایسا مظہر ہے جسے (محسوس کر کے) انسان دھنگ رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر مکرم: وہ کیسے؟

اکبر: دیکھ لیجئے انسانی وجود۔ حق تعالیٰ کے جن عجائبات اور حکمتوں کا آئینہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں اور یہ معلوم نہیں کسی کا قول ہے یا حدیث مبارک کہ **من عرف نفسه فقد عرف ربه** یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب

---

(۱) حقیر مترجم کے خیال میں ہکسلی نے ایک لحاظ سے ڈارون کے ذہن یا فکر کو میکانکی اور میشنی کہہ کر اس کی تردید کی ہے بلکہ اس کی ہنسی اڑائی ہے کہ وہ انسانی یا روحانی فکر سے ہٹ کر میکانکی طرز پر سوچ رہا تھا اور یہ اس کی غلطی تھی۔ واللہ اعلم۔ مترجم

کو پہچان لیا اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا ہے یداہ مبسوطتٰنِ یعنی اس کے دونوں ہاتھ فراخ ہیں۔ اور جیسے کہ قبل ازیں کہا جا چکا ہے کہ خدا نے اپنے لئے پنڈلی اور نفس کا بھی ذکر فرمایا ہے اور یہ تو ہماری سائنس بھی کہتی ہے کہ یہ مادی کائنات جن عناصر سے بنی ہے وہ بہ کمال وتمام ایک خاص اندازے سے وجود انسانی میں موجود ہیں۔ (یہ بھی کہ) انسان کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا وجود موجود نہیں جس میں یہ سب عناصر بحیثیت مجموعی پائے جاتے ہوں۔

مولوی احمد: اسی لئے تو انسان کو خدا کا خلیفہ کہا جاتا ہے۔

اکبر: ہاں! تو سنیئے ہم پہلے انسان کے سر کو لیں گے اور دیکھیں گے کہ حق تعالیٰ نے انسان کے سر میں اپنی حکمت کی کون کون سی نشانیاں رکھ دی ہیں۔

مولوی احمد: اچھی بات ہے۔ چلیں فرمائیں۔

اشرف: ہاں ہم ضرور سنیں گے۔

اکبر: جی تو آنکھ کی پتلی جس پر اشیاء کا عکس پڑتا ہے وہ مسور کے دانے کے برابر ہے جب پتلی کے ذریعے کوئی پردہ منعکس ہوتا ہے تو وہ پردہ اسے دماغ کے آخری حصے کی طرف منتقل کر دیتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پردے کا عکس دو تین ہزار گنا بڑا کر دیتی ہے یہ تو رہی سائنسی تحقیق۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پھر ہمیں پانچ فٹ قد رکھنے والا انسان کیوں پانچ فٹ ہی نظر آتا ہے؟ اگر دماغ کے پردہ نے اسے اتنا بڑا کیا ہو تو وہ پردہ بھی تو پانچ فٹ نہیں ہوتا وہ تو زیادہ سے زیادہ دو تین انچ کے برابر ہوگا۔

اشرف: بے شک! عجیب بات تو ہے۔ جناب ڈاکٹر صاحب! آپ یہ بتا دیں کہ انسانی

دماغ کی کل جسامت کتنی ہوگی؟ زیادہ سے زیادہ چھ انچ تو اس کے ذریعے پانچ فٹ کا انسان کیوں اور کیسے نظر آ سکتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہم انسان کا عکس ہی دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر مکرم: سائنس نے اس کی بھی کوئی نہ کوئی توجیہہ کی ہوگی۔

اکبر: خیر انسان کے سر کا ذکر ہو رہا تھا تو اب اس کی آنکھوں کو لیجئے آنکھوں مین جو پانی آتا ہے یعنی آنسو وہ نمکین ہوتا ہے مگر کیوں؟ تو یہ اس لئے کہ آنکھ کی گولی کے ارد گرد چربی ہوتی ہے اور چربی نمکین پانی سے صاف ہوتی ہے۔

اسلم: ہاں! یہ حقیقت ہے۔

اکبر: اب انسانی ناک کو لے لیجئے تو ناک کا پانی پیکہ ہوتا ہے اور ناک کے اندر جو بال ہوتے ہیں تو وہ اس لئے کہ مکھی یا مچھر وغیرہ ناک کے اندر جانے سے رک سکیں۔

ڈاکٹر مکرم: ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔

اکبر: اب کانوں کو لے لیجئے تو کانوں کے اندر کا پانی (مواد) تلخ ہوتا ہے اور اگر کوئی چھوٹا جاندار کان کے اندر گھس جائے تو مر جاتا ہے اسی طرح انسان کے دہن (منہ) کو لے لیں تو دہن کا پانی (لعاب دہن) میٹھا ہوتا ہے اس لئے کہ دہن کے ذریعے چیز کھائی جاتی ہے۔ تو فرمایئے ڈاکٹر صاحب! انسانی سر کے اندر مختلف قسم کا پانی خود بخود پیدا ہوتا ہے؟ کبھی نہیں! تو اس سے معلوم ہوا کہ ایک دانا و بینا اور حکیم ذات ہی اس کا خالق ہے۔

مولوی احمد: پھر یہ کہنا کیا مناسب ہے کہ انسان بھی ایک مشین ہی ہے جو اتفاقی طور پر پیدا ہوا ہے۔

اکبر: (اور سنئیے) اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ انسانی وجود ایک مشین ہی ہے تو آپ سب کو بخوبی معلوم ہے کہ جب ہماری کسی مشین میں خرابی پیدا ہوتی ہے تو ہم ایسی مشین کو مکمل طور پر کھول کر پرزے پرزے کردیتے ہیں اور اس کی خرابی دور کردیتے ہیں اور بعد ازاں تمام پرزے دوبارہ بحال بھی کردیتے ہیں اور مشین دوبارہ کام شروع کردیتی ہے۔

ڈاکٹر مکرم: ہاں یہ تو سب کو معلوم ہے۔

اکبر: اچھا تو ڈاکٹر صاحب! اگر انسان کو بھی ہم ایک مشین کہہ دیں اور (اس کے بدن میں خلل آنے کے بعد) اس کے اعضاء کو مشین کے پرزوں کی طرح الگ الگ کردیں اور (صرف یہی نہیں بلکہ) اس کو جوڑنے کی سعی کریں تو اسی انسان کا کام تمام ہوجائے گا۔

مولوی احمد: اچھی دلیل ہے۔

اسلم: یعنی انسانی وجود کی فعالیت اس کی حیات کی وجہ سے تھی جو اس کے اندر موجود تھی اور نیز یہ بھی کہ وہ حیات (زندگی) دانا بھی تھی اور بینا بھی تھی جبکہ جسم انسانی اس (حیات) کا ایک آلہ تھا۔

ڈاکٹر مکرم: اسلم خان! حیات (زندگی) انسانی اعضاء کی اجتماعی فعالیت ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ بذات خود زندگی کی کوئی مستقل صورت نہیں ہے۔

اکبر: ٹھیک ہے تو ڈاکٹر صاحب! فرض کیجئے ایک درخت ہے جو تیس برس تک مسلسل پھول اور پھل دیتا ہے اس کے بعد بے ثمر (بانجھ) ہوجاتا ہے نہ اس میں پتے ہوتے ہیں نہ پھل دیتا ہے جبکہ اس کا جسم صحیح وسلامت موجود ہوتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی مادے کو عارِض ہے اور بجائے خود مادہ میں زندگی نہیں

پائی جاتی ہے۔

اکرم: اور یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ یہ سارا عالم اور سارے عالم کی ہر ایک چیز بجائے خود حیات کی زندہ صورتیں ہیں یہی حیات ہے جو ذات کی حیثیت سے حق ہے اور کائنات کی صورت میں حیات (زندگی)۔ گویا اس نے صرف صفت کے طور پر ہی اظہار کیا ہے۔

مولوی احمد: اس سے تو وہی وحدۃ الوجود کا مسئلہ ثابت ہو گیا۔

اکبر: (جناب مولوی صاحب! غور فرمائیں) جب ہم یہ مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے اور اگر (خدانخواستہ) اس عقیدے کے ساتھ ساتھ یہ بھی مان لیں کہ کسی دوسری چیز کا وجود بھی موجود ہے تو اس سے حق تعالیٰ محدود ہو جائے گا کیونکہ وجود (واحد) کے مقابلے میں کسی دوسرے وجود کا کوئی امکان نہیں۔ ہاں یہ جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے یہ سب عین حق تعالیٰ کے وجود کے مظاہر ہیں جس کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں ظل کہا جاتا ہے اور ظل سے مراد وجود شے مرتبہ ثانی میں۔

مولوی احمد: تو کیا سمجھے ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر مکرم: مولوی صاحب! (سچی بات یہ ہے کہ) وجود باری تعالیٰ کے سلسلے میں سخت مشکلات سے دوچار ہو گیا ہوں۔ (حالت یہ ہے کہ اب) نہ تو اس کا انکار کر سکتا ہوں اور نہ اقرار۔

اکرم: تو معلوم یہ ہوا کہ آپ کے ذہن میں انکار کے ساتھ ساتھ اقرار کا وجود بھی باقاعدہ طور پر موجود ہے۔ (مگر اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ) یہ منفی اور مثبت قوتیں ہر چیز میں موجود ہوتی ہیں اور اسی تضاد ہی سے حیات (زندگی) جنم لیتی

ہے۔ (حتیٰ کہ) بجلی بھی منفی اور مثبت کنکشن سے پیدا ہوتی ہے۔

اکبر: (فی الحقیقت) حیات ایک ایسی حقیقت ہے جو ہمیشہ سے موجود ہے اور موجود رہے گی۔ (مزید برآں) یہی حیات اپنی حقیقت میں ذات ہے اور اس کا نمود کائنات ہے اور اگر کوئی دوسرا وجود یا دوسرا خدا ہوتا تو جیسے قرآن حکیم کا فرمان ہے۔ فساد اور تصادم پیدا ہوتا۔

مولوی احمد: ہاں! یہ ایک آیت قرآنی کا مضمون ہے۔

اکبر: (یعنی اگر دو خدا ہوتے) تو اس صورت میں ہر دو خدا محدود ثابت ہوتے (اسی طرح) ایک خدا کسی چیز کو ایک طرح سے تخلیق کرتا اور دوسرا کسی اور طرح سے (چنانچہ تصادم کا سلسلہ جاری ہوتا) (تاہم) عدم کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی بات یقیناً درست ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی ذات سے نہ تو ماقبل عدم موجود ہے اور نہ مابعد۔ بلکہ ذات حق ہی اول، آخر۔ ظاہر و باطن ہے۔

مولوی احمد: مگر ڈاکٹر صاحب کو پھر بھی شک ہے۔

ڈاکٹر مکرم: مولوی صاحب! میرے اس شک یا انکار کا خالق بھی تو خدا ہی ہے۔ قرآن بھی کہتا ہے کہ خدا نے کفار کی زبانوں، آنکھوں اور قلوب پر مہریں ثبت کی ہیں اور پردے ڈالے ہیں۔

داؤد: یہ تو صحیح ہے مگر مجھے حیرت ہے کہ جب میں کہتا ہوں کہ سب کچھ خدا خود کرتا ہے تو آپ لوگ اس میں شک کیوں کرتے ہیں؟

اکبر: داؤد خان! آپ نے بھی وہی بات کر دی کہ ایک آدمی نے دوسرے سے پوچھا کہ تمہارا کیا نام ہے؟ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ "مولیٰ" مگر پوچھنے والے نے اس سے آگے بولنے نہ دیا اور چھوٹتے ہی کہہ دیا کہ تم کافر ہو گئے۔ دوسرے

شخص نے کہا کہ بھلے مانس، آپ نے آگے بولنے نہ دیا ورنہ میں ''مولیٰ'' کے بعد ''داد'' بھی کہتا کیونکہ میرا نام مولیٰ داد ہے۔تو داؤد خان! بے شک اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے کفار کے دلوں پر مہریں ثبت کی ہیں مگر اس کا سبب بھی بیان فرمایا ہے۔

داؤد خان کون سا سبب؟

اکبر: ان کے کفر اور شرک کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی ﷺ چاہے آپ ان کفار کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں یہ ایمان نہ لائیں گے وہ تو مجبور ہیں۔

مولوی احمد: داؤد خان! میں نے آپ سے خدا کی مشیت تکوینی اور مشیت تشریعی کی بات کی تھی شاید آپ بھول گئے ہیں (مگر یاد رکھیں) کفر و شرک کا ارتکاب مشیت تکوینی میں شامل نہیں ہے بلکہ یہ مشیت شرعی سے تعلق رکھتے ہیں۔

داؤد خان: اور اگر خدا کے ازلی علم میں (کچھ لوگ) کافر اور مشرک ہوں تو پھر؟

اکبر: دیکھئے! علم کی وجہ سے وہ مسئولیت سے نجات حاصل نہیں کر سکتے (کیونکہ) علم خداوندی ارادہ خداوندی سے ایک الگ اور جدا چیز ہے اور اگر خدا کا یہ ارادہ ہوتا ہے کہ فلاں شخص مشرک و کافر ہوگا تو پھر مشیت شرعی کی ضرورت ہی کیا تھی؟

ڈاکٹر مکرم: شیطان کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے اور قرآن کہتا ہے کہ جس وقت خدا نے اس سے پوچھا کہ تم نے سجدہ کیوں نہ کیا تو بولا کہ میں آدم سے بہتر ہوں کیونکہ وہ خاکی ہے اور میں ناری ہوں۔

مولوی احمد: آپ کا اس سے مطلب کیا ہے؟

ڈاکٹر مکرم: میرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ ابلیس نے کہا کہ خدایا تو نے خود ہی مجھے گمراہ کیا۔

داؤد: واہ ڈاکٹر صاحب! کمال کر دیا آپ نے۔

اکبر: آپ پھر بھی نہ سمجھ سکے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ و کان من الکافرین اور ہو گیا وہ کافروں مین۔ (جبکہ علم الٰہی میں وہ تھا ہی کافروں میں) اور خدا نے اسے اپنے ارادے سے کافر نہ کیا تھا۔

مولوی احمد: ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم کے ساتھ اس کا ارادہ ضروری نہیں۔ (دیکھئے) اللہ تعالیٰ کو ہر آنے والے حادثے کا علم ہوتا ہے لیکن ہر حادثہ کی بنیاد میں اس کے ارادے کا ہونا ضروری نہیں۔

طالبِ دُعا: ودان علی حمزوی